نارَوا

غلام احمد فرقت

متشاعروں کے نام

ملنے کا پتہ

کتاب خانہ "دانش محل" امین الدولہ پارک لکھنؤ

بار اول　　　　نومبر ۱۹۴۶ء

قیمت

مرزا محمد جواد مالک نظامی پریس نے سرفراز قومی پریس سے چھپواکر شایع کیا

کچھ عرض کرنے سے پہلے

ادب اردو میں ظرافت کا آغاز نظم سے ہوتا ہے۔ ہجو، طنز، استہزا، ریختی سے لے کر جرکینیت تک ایک وسیع میدان ہے جس میں اردو شاعری مصروف تگ و دو رہی ہے لیکن اپنے ابتدائی دور ہی میں اردو ظرافت، اس نام انحطاط کا شکار ہوئی جو ہندوستان کے معاشی اور سیاسی انحطاط کے سبب سے زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو کر زوال سلطنت کا جیتا جاگتا مرثیہ بن گیا تھا۔ سودا اور مصحفی وغیرہ کی ہجویات ہوں یا رنگین و انشا کی ریختی سب ایک زوال پذیر نظام کی آئینہ دار ہیں۔ اور جرکین تک آتے آتے تو یہ صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ زوال اپنی انتہائی منزل پر پہنچ چکا ہے۔

متقدمین کے مزاح کی ایک نمایاں خصوصیت تنگ نظری ہے۔ اُن کے مزاح کا مقصد اپنے فریق مخالف کو شکست دے کر اپنی برتری ثابت کرنا ہے۔ ان کا مزاح سماج یا افراد کی کمزوریوں کا ہمدردانہ مطالعہ نہیں ہے بلکہ ایک معاندانہ پیکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ درباداری کا لازمہ یہ بھی تھا کہ اپنے رئیس کی خوشنودی مزاج کے لئے دوسرے رؤسا کی ہجو کی جائے اور اپنے کو رئیس کی نگاہوں میں افضل و اکمل بنا کے پیش کرنے کے لئے اپنے معاصرین کو نیچا دکھایا جائے اسی طرح رنگین، انشا اور جان صاحب کی ریختیاں عیش پسند حکمرانوں اور رنگیلے امیروں کی نشاطیہ بے اعتدالیوں کے مرقعے ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں ان دونوں اصناف میں مزاح اکثر و بیشتر ابتذال اور فحش نگاری کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

شائستگی اور تہذیب کی باریابی اس بزم میں بہت کم ہوتی ہے۔ چرکین نے تو وہ گندگی اچھالی کہ متقدمین و متاخرین سب سے آگے نکل گئے۔ اس ناگفتنی انبار میں جابجا وہ لطیف ظرافت بھی ضرور ملتی ہے جسے مذاقِ سلیم گوارا کر سکتا ہے مگر اس کی حیثیت سراسر ثانوی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تمام اصنافِ سخن کو برتنے والے درباری مسخرے معلوم ہوتے ہیں جن کی زندگی درباروں کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر نکل کر سانس لینا نہیں جانتی ان کو مسخرے بن پر انعام ملتے تھے اور انعام پاکر انھیں اس بات کا دھیان نہ رہتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے کمال کو کن پستیوں میں ڈھکیل رہے ہیں۔ یہی حال کم و بیش اس زمانے کے ہزل گویوں کا بھی تھا میر اٹل، جعفر زٹلی، تراانی، افسق وغیرہ سب کے سب رئیسانہ خوشنودی کی بزم میں ننگے ہوکر ناچ رہے تھے اور ضمیر کو واہ وا کے وزن اور انعام واکرام کے بوجھ سے دبائے جارہے تھے۔

لیکن یہ رہی سہی دیسی حکومتیں بھی جب چل بسیں اور حکومت غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر بالکل دفتری ہوگئی تو درباری شاعروں اور ادیبوں کی گنجائش کہاں تھی۔ کچھ لوگ اب بھی حکومت وقت کی شان میں قصیدے کہتے تھے اور کبھی کبھی کوئی ملازمت یا کوئی انعام بھی پا جاتے تھے لیکن اس سے حکومت وقت کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ نہ وہ محفلیں رہیں نہ وہ رنگ رلیاں۔ پرانا نظام دم توڑ رہا تھا۔ نئی نئی قدریں وجود میں آرہی تھیں۔ پرانی راہوں کے چلنے والے زمانے کی تیز رفتاری سے پریشان تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ جھنجھلاتے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس دور میں شاعر اور ادیب کے دل و دماغ میں کرب و اضطراب کے نشتر چبھوئے جارہے تھے۔ جن لوگوں کے احساسات شدید اور سیاسی شعور قدرے بیدار تھا وہ دل کی بات زبان پر لانا چاہتے تھے مگر مجبور تھے کیونکہ صیاد کی مرضی یہ تھی کہ گرفتارِ قفس گھٹ کے مرجائے لیکن اُف نہ کرے۔ اس روک ٹوک اور قدغن

نے بے بسی کا احساس شدید کر دیا۔ سیاسی اعتبار سے جو کچھ ہو رہا تھا اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ کوئی راہِ عمل نظر نہ آتی تھی کھل کے کچھ کہنا مشکل تھا۔ غزل میں نوحہ خوانی کی جا سکتی تھی لیکن نوحہ خوانی سے دل کے جلے پھپھولے ہی تو ٹوٹتے تھے یہ بھی گھٹ گھٹ کے مرنے کی ایک دوسری شکل تھی۔ رفتہ رفتہ ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جو راجہ رام موہن رائے اور سر سید کی سرکردگی اور مغربی علم ثقافت کی روشنی میں ہندوستانی سماج کی اصلاح کا علمبردار بن گیا۔ اس کے علاوہ کانگریس کے قیام کے بعد سیاسی شعور بڑھنے لگا تھا اور طرزِ حکومت میں اصلاح کے مطالبے بھی کئے جا رہے تھے ایک دھندلی سی وطن پرستی دلوں میں چٹکیاں لے رہی تھی یہ سیاسی نیم بیداری کا دور تھا۔ دوسری طرف کچھ لوگ ماضی کی شوکت و عظمت کے خواب دیکھ رہے تھے اور اُنہی سے وابستہ ہو جانا چاہتے تھے ان کی نظر میں جدّت پسندی پرانی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کے ساتھ کھلی ہوئی بے انصافی تھی۔ وہ اس سے ناراض تھے اور کسی طرح مصالحت نہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن زمانہ کے دھارے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ان کے قدم کسی جگہ جم نہ پاتے تھے۔ اس بے بسی و اضطراب کے عالم میں ادب اُردو میں ایک نئے طنز، استہزا اور مزاح کا ظہور ہوا۔ یہ "اودھ پنچ" اسکول تھا۔ اس اسکول کے خاص افراد منشی سجاد حسین۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی، اکبر الٰہ آبادی، سرشار، نواب سید محمد آزاد ظریف لکھنوی، اور ممتاز حسین عثمانی تھے، یہ گروہ اصولاً کانگریس کا حامی، قومی حقوق کی محافظت کا علمبردار، ہندوستانی روسا کا مشفق ناصح اور ہمدرد مخلص ادب، ہندو مسلم اتحاد کا پیغامبر تھا لیکن سوشل اور معاشرتی معاملات میں قدامت پرست تھا۔

"اودھ پنچ" اسکول کی ظرافت نے ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد محض تفریح نہ تھا بلکہ مزاح کے پردے میں زندگی کے دردناک حقائق اور زخمی پہلوؤں پر تبصرے

ہوتے تھے۔ تاکہ پڑھنے والا زیرلب مسکرا تا جائے لیکن اس مسکراہٹ کے باوجود اس کو یہ احساس بھی رہے کوئی اس کی دکھتی رگیں چھیڑ رہا ہے کبھی کبھی طنز کا نشتر اس بیدردی اور سفاکی سے چلتا کہ مریض تڑپ اٹھتا لیکن پھر اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ شاید یہی نشتر اس کے سرطان کا مداوا ہے۔ اس گروہ کا مقصد تھا کہ اپنے ہوئے سماج کو ہنسا نا اور ہنسا ہنسا کے رلانا یہ لوگ حتی الوسع ذاتیات سے بچتے تھے (اگرچہ کبھی کبھی "اودھ پنچ" کے صفحات پر خوب دھول دھپے ہوئے) ابتذال اور عامیانہ پن کے خارزار دل میں بھی کبھی کبھی دامن الجھا لیتے تھے لیکن علی العموم اس سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے تبصروں میں ایک ہمہ گیری تھی اور ان کی تنقید وں میں ایک جاندار لطافت، معنویت اور گہرائی۔ جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان مزاحیہ نگاروں کا خلوص ہے۔ ان کی تنقیدیں معاندانہ شاذو نادر ہی ہوں گی۔ زیادہ تر ہمدردانہ تھیں۔ ان کے خیالات میں وسعت تھی۔ اور ان کا مطمح نظر اصلاح تھا۔ لیکن ان میں کچھ وضعداریاں بھی تھیں اور کچھ جانبداریاں بھی۔ اسی وجہ سے یہ لوگ بہک بھی جاتے تھے۔

اودھ پنچ اسکول کے بعد ہم براہ راست دور حاضر کے ان ادیبوں سے ملتے ہیں جنھوں نے تاریخ کے ایک نہایت غیر مستحکم اور متزلزل دور میں فطرت نے مزاح نگاری کی خدمت سپرد کی ہے۔ ان لوگوں میں انفرادیت اتنی نمایاں تھی کہ یہ لوگ کوئی مستقل جماعت نہ بنا سکے تاہم ان لوگوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد، عظیم بیگ، شوکت تھانوی، پطرس، ہری چند اختر، رند لکھنوی، کنھیا لال کپور، اور جعفری وغیرہ ہیں۔ ان لوگوں کی نظر میں اگر ایک طرف کائنات کی جزئیات پر ہیں تو دوسری طرف عالمگیر مسائل پر بھی۔ ان کے مزاح کی بنیاد انسانی اور انفرادی کمزوریوں پر ہے مگر یہ ان کمزوریوں پر آنسو نہیں بہاتے بلکہ ان کمزوریوں کا مضحکہ کرتے ہیں۔ ان مزاح میں ان کمزوریوں کا تجزیہ ہوتا ہے اور ان کو سمجھنے کی کوشش

اسی وجہ سے ان کے مزاح میں ایک افادیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان مزاحیہ نگاروں کا مطمح نظر زیادہ تر تعمیری ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ تعمیری مقصد اصلاح پسندی کے آگے نہیں بڑھتا، لیکن اکثر ان کے نظریوں کی ترقی پسندی بھی چھپی نہیں رہتی۔

یہ ترقی پسندی ایک عالمگیر تحریک کا پرتو ہے جس کی ابتدا مارکس اور انگلز کے مادی فلسفہ اور جدلیاتی افکار سے ہوتی ہے۔ مارکس نے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ فلسفی اب تک کائنات کی تشریح و تفسیر کرتے رہے ہیں لیکن آج فلسفہ جس مسئلہ سے دوچار ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کو کس طرح بدلا جائے اور دنیا کی نئی تشکیل کس طرح کی جائے کہ بے انصافیوں کا خاتمہ ہو اور کائنات کا بگڑا ہوا توازن درست ہو۔ مارکس نے فلسفہ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ بڑی حد تک ادب کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے اور صحیح ہے۔ ادب کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد صرف تفریحی اور سطحی نہیں ہو سکتا۔ اگر ادیب، اپنے شاہکاروں کو حقائق کی دنیا سے الگ تھلگ ایک سراسر خیالی دنیا میں بند کئے رکھنے کا کوئی تصور رکھتا ہے تو وہ بہت بڑے فریب میں مبتلا ہے۔ اس کا ادب زندگی کے بدلتے ہوئے معیاروں پر ضرور جانچا جائے گا اور اگر اس میں مقتضیات زمانہ کے پورا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اسے بیسویں صدی کی بزم حیات میں کوئی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اب ادیب صرف گندگی اچھال کے بہ یک جنبش قلم سازی دنیا کا مذاق اڑا کے، اچھائیوں رومانی تذکرہ کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ آج زندگی لمحہ بہ لمحہ نئی نئی کروٹیں بدلنے کیلئے بیتاب ہے۔ آج ادیب ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھ کر اس دنیا کا تماشا نہیں کر سکتا۔ زندگی اسے بھرے بازار میں گھسیٹ لائی ہے۔ اور اس بازار کے ہنگاموں میں اسے بھی فریق بننا ہی پڑے گا۔ وہ بھی تو ہماری نئی زندگی کا معمار ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ادیب باوردی سپاہی نہیں جو فوجی حکام کے چشم و ابرو کے اشاروں پر

رقص کرتا ہے ادیب میں ایک صلاحیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیدیں توڑ دے اور سماجی قدروں کی کھائیاں پار کر کے ایک تخئیلی حقیقت کی تخلیق کی خدمت انجام دیتا رہے۔ ادب پھر بھی ادب ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر بات جو ترقی پسند ہو ادب بن جائے۔ اس میں گنجائش کلام نہیں ہے یقیناً ہم بھی ادیب کے دماغ و قلم سے میدان قرطاس پر فوجی قواعد نہیں کرانا چاہتے ہم جانتے ہیں کہ ہر رنگروٹ کمانداری نہیں کر سکتا۔ زبان و قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ادب نہیں ہوتا لیکن ادب ہونے کے بعد بھی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہ ادب کیسا ہے۔ یہ ہمیں زندگی کی جنگ میں پسپائی پہ آمادہ کر رہا ہے یا فاتحانہ انداز سے آگے بڑھنے کا اشارہ۔ یہیں سے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ آل احمد سرور لاکھ کہیں کہ ادب پر کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن جب تک انسانی زندگیوں پر خلوص و ریاکاری، ایمانداری اور بے ایمانی، باعملی اور بے عملی کے لیبل لگتے رہیں گے جب تک انسان دوستی اور غداری، رجعت و ارتقا کے راستوں پر چلتے رہیں گے اس وقت تک اُن کے تمام کارناموں پر چاہے وہ سیاسی ہوں یا ادبی لیبل ضرور لگائے جائیں گے تاکہ کھوٹے کھرے کی تمیز ہو سکے۔ اب ادب کے شیدائیوں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ادب ایک مخصوص اور محدود حلقے سے نکل کر وسیع محفلوں میں باریاب ہونے کا تمنائی ہے ایسی حالت میں یہ جانچ پڑتال ضروری ہے کہ یہ لائق باریابی ہے بھی یا نہیں۔ اس کے اثرات سماج کے لئے صحت بخش ثابت ہوں گے یا مضر۔

اس جانچ پڑتال میں اگر ہم نئے اوزار اور آلے استعمال کرتے ہیں تو عطائیوں کے برانگیختہ ہونے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھیں یہ دھڑکا لگا ہے کہ اُن کی روزی ماری جائے گی۔ اس نئی تشکیل اور تعمیر کے دور میں اُن پرانی قدروں کو سرے سے بدلنا ہی پڑے گا جو مرور ایام سے اپنی افادیت کھو چکی ہیں ۔

روس کا زبردست سماجی انقلاب خاک و خون کے طوفان سے گزر کر کامیاب ہوا۔ غلام آباد ہندوستان بھی سیاسی اور اقتصادی امتیاز سے ایک تپتا جلتا ریگستان بن چکا ہے۔ مبہم وطن پروری، ہوم رول کی جدت، تشدد، بدیسی مالکوں کا دیسی آمروں سے تبادلہ —— یہ سب زمانہ ماضی کے افسانے بن چکے ہیں۔ آج عوام بیدار ہیں اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نئی طاقت کا احساس ہمارے ادب میں لازمی طور سے ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہو تو "سودیشی ریل" ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ ہونے کے باوجود رجعت پسند رہے گی کیونکہ "سودیشی ریل" موجودہ حالات سے مطمئن اور ترقی سے خائف ہے۔ اور اس برطانوی عقیدے کی تصدیق کرتی ہے کہ ہندوستانی حکومت کے اہل نہیں۔ سودیشی ریل کے بعد دنیا کے جھمیلوں نے شوکت کی بھی آنکھیں کھولیں اور وہ بھی "خان بہادروں" میں برائیاں دیکھنے لگے۔ انھیں پرانے نظام کی بربادی و بے استواری کا احساس ہونے لگا ہے۔ پطرس کے یہاں زندگی کی تنقید میں جان ہے، اس لئے کہ وہ پرانے نظام کے کھوکھلے پن سے واقف ہے۔ رشید احمد اور کنھیا لال کی ترقی پسندی میں ماضی سے تھوڑی سی دلچسپی باقی ہے پھر بھی اُن کی نظریں انسانیت اور کائنات کے مسائل پر رہتی ہیں۔

اس طویل داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ مزاح بھی ترقی پسند عناصر کے ہاتھوں میں ایک اوزار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے تعمیری کام لیا جاسکتا ہے لیکن مزاح نگار کا طریق کار دوسرے ادیبوں سے مختلف ہے۔ اس کے محسوسات اور مشاہدات کا دائرہ نسبتاً محدود تر ہے۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ سطور میں ایک جگہ تذکرۃً لکھا ہے مزاح کی بنیاد انسانی اور انفرادی کمزوریوں پر ہے۔ کچھ کمزوریاں ذاتی ہوتی ہیں اور کچھ سماجی، کچھ فطری اور کچھ کسبی۔ انھیں کمزوریوں، لغزشوں، خامیوں اور بے اعتدالیوں پر مزاح کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے۔ ہر سماج میں زندگی کا ایک معیار مقرر ہوتا ہے۔ یہ معیار بدلتے بھی

رہتے ہیں پھر بھی کسی ایک وقت میں کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہوتا ہے۔ یہی نقطۂ اعتدال ہے۔ اگر اس نقطۂ اعتدال سے کوئی پست تر منزل پر آجاتا ہے یا تجاوز کر جاتا ہے تو وہ مزاح کا نشانہ بننے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے لیکن اگر افراط و تفریط اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر ہمیں اس کی حالت پر رحم آنے لگتا ہے۔ جیسے اگر کوئی موٹا تازہ انسان کائی میں پھسل کر گر جائے تو ہمیں ہنسی ضرور آئے گی لیکن اگر اس کا سر کسی اینٹ سے ٹکرا کے پھوٹ جائے اور خون بہہ نکلے تو ہنسی کے بجائے ہمارے لبوں سے چیخ نکلے گی ــــ یہ باتیں مزاح کے بارے میں علی العموم صحیح ہیں لیکن طنز پر تو ان کا ہو بہو انطباق ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب کا مصنف، غلام احمد فرقت، ایک مدت تک مشہور قوم پرور روزنامہ "حقیقت" کا کف گلفروش رہ چکا ہے جب تک اس کو یو پی کے سول سکریٹریٹ میں داخل دفتر نہیں کیا گیا تھا یہ روزانہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں پر اس بے باکی سے حملہ کرتا تھا گویا سب اسی کے ماتحت ہوں۔ سکریٹریٹ میں جب کسی دستاویزی فائل کی طرح اسے بھی ایک محکمہ سے دوسرے محکمہ میں گردش دی گئی تو کچھ دنوں چوکڑی بھولا رہا۔ زبان تو اب بھی قینچی کی طرح چلتی تھی لیکن قلم پر "زیر غور" کا لیبل لگا دیا گیا تھا۔ گل فروشی و شکم پروری کی جنگ میں اول الذکر کو شکست دے کر فرقت نے اپنے مزاح کو داخل محافظ خانہ نسیان کر دیا تھا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

وہ ضرورت بہت جلد ظہور میں آئی۔ میں نے جس ترقی پسندی کا سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے وہ پہلے تو ایک تحریک کی شکل میں ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ظاہر ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ادب کو اس غار سے باہر نکالا جائے جس میں اسے بے جان قدامت اور دور انحطاط کے روایات فرسودہ نے گرا دیا تھا۔ اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ تصنع اور ظاہر داریوں کے بے لطف

بیابانوں سے نکال کے ادب کو خلوص اور وسیع النظری کے نخلستانوں کی سیر کرائی جائے۔ تھلک۔ عیش پرستیوں کے بستر علالت پر ادب کا مریض دم توڑ رہا تھا۔ اسے دارو ئے حیات دینے کا فریضہ ترقی پسند ادیبوں کے سپرد ہوا لیکن جو روایات دلوں میں گھر کر چکے تھے ان کا انسداد آسانی سے نہیں ہوا۔ بلکہ ان روایات نے چولے بدلنا شروع کئے تاکہ مدت حیات کچھ اور بڑھ جائے ایک بات یہ بھی ہوئی کہ جو لوگ ترقی پسندی کا نعرہ بلند کر رہے تھے وہ زیادہ تر مغربی علوم اور اثرات سے مرعوب تھے۔ ان میں سے ایسے بہت کم لوگ تھے جنھیں دیسی زبانوں میں کوئی خاص درک رہا ہو یا جن کی ملکی ادب میں کوئی اہمیت۔ ٹیگور اور اقبال کی ترقی پسندی بھی مغرب سے متاثر تھی لیکن اس پر دیسی رنگ گہرا چڑھا تھا پھر ان لوگوں کا مابعد الطبیعاتی رجحان دوسرا ہی نغمہ سنا رہا تھا۔ یہ قدیم وجدید کے مابین رشتہ اتصال تھی مگر جدید تر گروہ بدقسمتی سے کم مرتبہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس لئے یہ نقالی کرنے پر تل گئے۔ اور اردو حسب عادت اس نقالی پر راضی بھی ہو گئی۔ کیونکہ اردو ادب نے پہلے برج کی نقالی کی، پھر فارسی کی، پھر کسی قدر مغربی زبانوں کی۔ جب ترقی پسندی کا نعرہ بلند ہوا تو چند سر پھروں نے بے سوچے سمجھے ہر نئی بات کو ترقی پسندی کا مرادف سمجھ کے مغربی خیالات کی نقالی شروع کی مگر دشواری یہ تھی کہ یہ نقال نہ تو مغربی روایات سے بخوبی واقف تھے نہ مغربی علوم اور ثقافت سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نیم حکیم ادب کے لئے خطرۂ جان بن گئے۔

بالخصوص اردو شاعری پر اس جدت پسندی کی بے راہ رو تحریک کا سب سے برا اثر پڑا اردو شاعری کی بیشتر کائنات عشقیہ تھی۔ وہ شخص جسے ادب سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ اس ترجیحی رجحان سے واقف ہے اور محبت کا موضوع بذات خود ایسا عالمگیر موضوع ہے بھی جس کی ہر دلعزیزی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن محبت کے ہر پہلو پر غزل گویوں نے اس طرح خامہ فرسائی

کی تھی کہ اس میں عمومی حیثیت سے کوئی ندرت باقی نہ رہ گئی تھی - کچھ لوگ نظموں میں بیباکانہ اظہار محبت کرنے لگے تھے - اور یہ محبت ناکامیوں کے ساتھ ساتھ کامیابیوں سے بھی ہم کنار ہو چکی تھی لیکن اتنا ہونے پر بھی محبت کے ساتھ ایک غیر معمولی پاکیزگی، روحانیت اور مابعد الطبعیاتی تخیل وابستہ تھا - فرائڈ، ایڈلر اور ینگ وغیرہ کے طفیل میں محبت کا جنسیاتی اور نفسیاتی پہلو زیادہ آجاگر ہوا - اور اس جنسی جذبہ کی کارفرمائیاں ہر شعبہ حیات میں ڈھونڈھی جانے لگیں - اس سے ایک نئی راہ کھلی یعنی شاعری کا موضوع "محبت" سے ہٹ کے "جنسیات" بن گیا -

نفسیاتی تحلیل اور تجزیہ کا کام اتنا آسان نہیں جتنا لوگ علی العموم سمجھتے ہیں - یہ ایک مستقل فن بن چکا ہے اور اس کے لئے مبلغ علم کی حاجت ہے - انسان کے ہر غیر معمولی جذبے، ہر بھول چوک، ہر الجھن ہر بلند پروازی میں مختلف پیچیدگیاں شامل تھیں جنھیں نیا علم النفس حل کرنا چاہتا تھا سماجی احتساب، قانونی قدغن، روایتی روک ٹوک سب مل کر زبان اظہار کو گنگ کر رہے تھے اور جذبات دب دبکے نئی نئی شکلوں میں ابھرتے اور انسانی معمولات میں حارج ہوتے تھے تحت شعور کی جلوہ نمائیاں اور لاشعور کی کارفرمائیاں آسانی سے ذہنوں کی گرفت میں نہ آتی تھیں ان کے لئے کئی تدبیریں استعمال کرنا پڑتیں تب کہیں جاکے گہرائیوں میں مدفون خزانوں سے جھلک رسائی دیتی - "اس کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے عمل سے ہر کس و ناکس کو دلچسپی کیسے ہو سکتی تھی ؟ اور یہ ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں تھی اس لئے لوگوں نے "ابہام گوئی" کا ایک انداز اختیار کیا - اور اس پردے میں انتہائی ناکارہ ہیں وربزدلی کے ساتھ اقرار جرم کرنا شروع کیا - انھیں جرم کا احساس شدید تھا - اپنے گھناونے امراض کا احساس بھی تھا اس لئے وہ کچھ اس جذبے کے ماتحت اظہار خیالات کرتے تھے جیسے غالب نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شاید اس سے اُن کے دل کا بوجھ وقتی طور پر کم ہو جاتا تھا لیکن آپ جانئے کہ بال کی کھال نکالنے والے بھلا کب نچلے بیٹھنے والے تھے انھوں نے ان نظم گویوں کے ذہنی گورکھ دھندوں کے حل کی تلاش میں سارے حالات زندگی کا پتہ چلانا شروع کیا۔ اور پھر وہ راز جو "ابہام" کے سینے میں چھپایا جا رہا تھا۔ بالآخر آشکار ہو کے رہا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ اب کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں۔

ایک اور گروہ "خالصتہً لوجہ الاشتراکیت" قسم کے ادیبوں کا تھا جو آگ اور آندھی، خون اور بے نظم بغاوت کو ترقی پسندی کی انتہا سمجھتے تھے۔ انھوں نے ادب پر اس انداز سے دھاوا کیا کہ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا مکمل قحط ہوتا تو شاید آج انجمنوں کے چندے کی رسیدوں اور مختصر آزاد نظموں میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں پر توڑ پھوڑ کا ایک جنون سوار تھا جس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ یہ ہوائی انقلاب پسندی کچھ دنوں تک ادیبوں اور شاعروں کو اپنے عمزوں سے لبھاتی اور للچاتی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس سوڈے کی بوتل کا اُبال کم ہوا اور غور و فکر سے کام لیا جانے لگا اس غور و فکر میں ادیبوں کے سیاسی معتقدات کی بنا پر مزید گروہ بندیاں ہوئیں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے شعرا جن کی ابتدا کافی امید افزا تھی سیاسی پادری بن گئے اور اخبار نویسی یا تشاغب کو نفس ادب سمجھ کر ادب کو ایک نئی گمراہی کی طرف لیجانے لگے یہ گمراہی فنی تو تھی ہی لیکن سیاسی بھی کچھ کم نہ تھی کیونکہ جس سیاست کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا گیا تھا وہ خود ساری قومی تحریک کو اسفل السافلین کی طرف گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ ان ادیبوں نے روس کے دفتر امور خارجہ کے درباریوں کی ایک منظم انجمن بنائی تھی اور بلند پردازیوں اور فنی موشگافیوں کی داستان کا خلاصہ بس اتنا تھا کہ ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　　آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

اسی دوران میں اردو شاعروں نے نئی عروضی راہوں پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ نظم معرّیٰ اور نظم آزاد میں تجربے کئے جا رہے تھے۔ ان تجربوں کی جدّت میں ایک لذّت تھی۔ اور اس لذت کو ہر دماغ محسوس کر رہا تھا۔

بھیڑوں کے گلّے کی طرح شاعروں کی ایک ٹولی اس لذت پر ٹوٹ پڑی لیکن حق یہ ہے کہ فیض اور راشد کے علاوہ کسی نے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ بلکہ نسبتاً فیض سب سے زیادہ کامیاب رہا کیونکہ فیض کا تعلق اردو کے لسانی روایات کافی گہرا تھا۔ اس نے دارو ئے تلخ کی ایک چھوٹی خوراک تجربتاً مریض قدامت کو پلائی تھی اور اس میں وہ بہت کامیاب رہا۔ ن۔ م۔ راشد کا عروضی اجتہاد زیادہ محلِ نظر تھا اس پر انھوں نے ابہام گوئی اختیار کر کے اپنے راستے کو اور مشکل بنا لیا پھر بھی اپنے ہم عصروں میں وہ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ افکار کے اعتبار سے یہ لوگ اعتراضات سے نہیں بچ سکتے۔ ان کے خیالات مسلّمات کی حد میں داخل نہیں ہیں بلکہ ان کو نزاعی موضوعات سے دلچسپی ہے۔ اس لئے ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ یہ مخالفت غلط طریقہ سے اور نامناسب و غیر متعلق حلقوں سے شروع ہوئی لیکن رفتہ رفتہ باشعور طبقہ بھی اس اقدام کی افادیت کے بارے میں سوالات کرنے لگا انھیں میں فرقت بھی تھا۔

فرقت کی مزاح نگاری اس پس منظر میں سب سے پہلے "مراوا" کا لباس پہن کر سامنے آئی "مراوا" کا مقصد پیروڈی تھا۔ لیکن زیرِ نظر مجموعہ کا مقصد عہدِ جدید کے شعرا کا ظریفانہ جائزہ لینا ہے۔ اب بھی یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ فرقت کے ترکش کا یہ آخری تیر نہ ہوگا۔

مجموعے کے سرسری مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی فرقت نے عہدِ جدید کے تمام شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور ان کو تا بحدِ امکان سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا اندازہ صرف اسی

ایک بات یہ ہو جاتا ہے کہ اس مجموعے میں تقریباً اکیاسی آزاد نظم لکھنے والوں اور ترقی پسند شعرا
کے تمام رطب و یابس یکجا کر دیے گئے ہیں۔ فرقت اس کا قائل نہیں ہے کہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا
کڑوا تھو تھو" اس کی تنقید کے دسترخوان پر جو کی سوکھی روٹی سے لے کر روغن اور لطیف غذاؤں تک جو کچھ
میسر آ سکتا ہے سب کچھ چن دیا گیا ہے اگر پنجابی سالن میں مرچیں تیز ہوں یا گجراتی ترکاریوں میں
تھوڑی سی شکر ملا دی گئی ہو تو اس کی ذمہ داری فرقت پر نہیں ہے کیونکہ ہر ملک کے رہ رستے سے اس کی
شکایت بیکار ہے کہ فرقت کو واجد علی شاہی کھانے زیادہ پسند ہیں۔ ان میں ایک نظم اور ایک
اعتدال بلکہ ایک صحیح اور باذوق باورچی کی لطافتوں کا مظاہرہ ہوتا ہے شاید اس کا سبب یہ ہے کہ
فرقت خود یو۔پی کا رہنے والا ہے لیکن وہ تنگ نظر نہیں ہے۔ وہ پنجاب کی لسی کا بھی دلدادہ و شیفتہ
ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ انارکلی والی دوکان پر لسی سب سے اچھی ملتی ہے۔ اگر اس دن اسے بنگالی
رس گلا مل جاتا تو وہ اس لطیف مٹھائی کی بھی دل شکنی نہ کرتا۔ فرقت کے تنقیدی دل کا ایک گوشہ
برسات کا نمک ہے بہت آسانی سے پسیج جانے والا۔

فرقت کی تنقید کتابوں کے اقتباسات سے بوجھل نہیں ہے یہ ایک ہلکی پھلکی چیز ہے۔ مگر
نشتر دینے کی ضرورت پڑی ہے تو فرقت نے محض اسے کلوروفارم سنگھا دیا ہے۔ اور اگر تعریف بھی کی ہے
تو ایسے بے لاگ انداز سے کہ پڑھنے والا گھبرا اٹھے۔ میں عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہے مجھے
امید ہے کہ فرقت کی یہ تصنیف ہمارے تنقیدی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگی۔

علی جواد زیدی

لکھنؤ حامد پارک
۲۱ / اگست ۱۹۴۷ء

زندگی کی کروٹیں

میری زندگی کیا ایک آزاد نظم ہے جس میں نہ قافیہ ہے نہ ردیف۔ نہ پابندیاں ہیں نہ
بندشیں، نہ کیف ہے نہ سرور ایک الجبرا کے کسر کا سا سوال ہے جو منفی سے شروع ہوتا ہے پھر
بریکٹ آتے ہیں پھر مثبت اور منفی کے نشانات ہیں اور اخیر میں بڑے بڑے اعداد ہیں جو
دور تک ایک دوسرے سے ضرب ہوتے چلے گئے ہیں۔ اس کٹھن کسر کے سوال کے شروع
میں منفی کا نشان

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے؟

اس منفی کے نشان کی تفصیل یوں سمجھ لیجیے کہ میری تخلیق ہی ایک خاص نوعیت سے ہوئی
ہوئی یعنی عام بچوں سے مختلف دو ماہ پہلے ۱۲ سنہ ۱۹ء میں سات مہینے کا پیدا ہوا میری جائے
پیدائش کاکوری لکھنؤ کا ایک مشہور قصبہ ہے جہاں کے شرفا اودھ میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں
حضرت محسن کاکوروی میرے جدِ امجد تھے۔ پانچ چھ سال کا تھا کہ باپ کے سایۂ عاطفت
سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکار رہا۔ قدم قدم پر آلام و مصائب ہاتھ
باندھے کھڑے تھے۔ والدہ کو پندرہ روپیہ ماہوار شیخ صفدر علی صاحب جو اس زمانہ میں
دربار رامپور سے وابستہ تھے بطور وظیفہ ملتے۔ اس قلیل سی رقم میں بھائیوں اور بہنوں کا گذارا
تصور تو کیجیے کہ کس قدر دشوار تھا۔ نہ کوئی اثاثہ تھا نہ جائداد چنانچہ زندگی کا ہر لمحہ تلخ گھونٹ

تھا جسے بہرحال بنیا تھا۔

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

شروع میں اُردو فارسی کی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول میں داخل ہو گیا جہاں میرے دوسرے اعزا کے لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں تحریک خلافت پورے شباب پر تھی، فضا کراچی کے قیدیوں کے ترانوں سے گونج رہی تھی۔ روزانہ عام میں بڑے بڑے سیاسی جلسے ہوتے تھے۔ اور لکھنؤ ہندوستان کی سیاست کا ایک مرکز بنا ہوا تھا اخبار حقیقت لکھنؤ اس زمانے میں نیا نیا ہفتہ وار سے روزانہ ہوا تھا۔ یو۔ پی میں صرف دو ہی اخبار تھے۔ ایک ہمدم جسے سید جالب صاحب دہلوی مرحوم نکالتے تھے اور دوسرا حقیقت سویرے سے دس بجے تک اسکول جانے سے پہلے میں اخبار حقیقت کی سو سوا سو کاپیاں لے کر شہر کے گلی کوچوں میں نکل جاتا اور گھنٹہ سوا گھنٹہ میں کل کاپیاں کھیلوں کی طرح بک جاتیں اس بکری میں میرا کمیشن ۴ / فی روپیہ ہوتا۔

چند سات ماہ تک یہ صورت رہی اور لکھنؤ کے گلی کوچوں میں ذہن کا گزر بنا رہا اس زمانہ کی چند تلخ حقیقتیں اب تک دل پر نقش ہیں اگرچہ اُس زمانہ میں وہ بے حد کڑوی معلوم ہوتی تھیں مگر اب اُن میں اتنی ہی شیرینی محسوس کرتا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اخبار بیچ کر دس بجے اسکول پہونچتا تو میرے اعزہ کے لڑکے مجھ پر سخت آوازے توازے کستے اور اخبار کی جن سرخیوں کو پکار پکار کر میں اُس روز شہر میں اخبار بیچ آتا انھیں سرخیوں کو دُہرا دُہرا کر سب میرا مذاق اُڑاتے اس لئے بعض اوقات درجے کے دوسرے لڑکوں کے سامنے بڑی بکی سی محسوس ہوتی مگر اس میں ان لڑکوں کا کیا قصور اس میں تو ہمارے سماج ہی کی کچھ کمزوریاں مضمر ہیں۔

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے
رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

اگر فضا میں درحقیقت تمام آوازیں محفوظ ہیں تو اس زمانہ کی آوازوں میں آپ میری آواز بھی اخباروں کی سرخیاں پکارتی اور "حقیقت اخبار دو پیسے کو" کی صدا لگاتی سنیں گے کراچی کے اسیروں کی داستانوں سے اخبار بھرے ہوئے تھے۔ آج بی اماں کا بیان نکل رہا ہے تو کل اسیرانِ سیاسی کے پیغامات شائع ہو رہے ہیں۔ غرض ہندوستان کی فضا ہندو مسلم اتحاد کے نشہ میں سرشار تھی اور گوشہ گوشہ سے یہی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

ہندوستان کی سیاست کا یہ دور بھی ایک یادگار دور کہا جاتا ہے۔ شام کو جب اسکول سے واپس ہوتی تو مغرب تک کا وقت گویا میری تفریح کا وقت تھا۔ ان اوقات میں اکثر رفاہ عام کے جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا جہاں علی برادران گاندھی جی اور دیگر محبانِ وطن کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوتا۔ اگرچہ اس زمانہ میں ان کی تقریریں بہت کم سمجھ میں آتیں مگر چونکہ مجمع بہت کافی ہوتا اور اس سلسلے میں دس پانچ دکانیں بھی لگی ہوتیں اس لئے اس میں میری شرکت محض ایک میلے کے تماشائی کی حیثیت سے زیادہ ہوتی

سال میں دس روز یکم محرم سے دس محرم تک محلہ راجہ بازار میں تعزیے فروخت ہوتے ہیں گھر سے تو محض تعزیے دیکھنے کے بہانے سے جاتا مگر وہاں پہنچ کر دوکانداروں سے تعزیے لے کر رات کے دس گیارہ بجے تک تعزیے بیچتا "ایک تعزیہ ہدیہ کر دو الین بھیا کی منت کو بھیا کی جنت کو" اس میں آٹھ دس آنے یومیہ مل جاتے غرض عجیب سرمایہ دارانہ قسم کی ذہنیت تھی مگر جو لوگ زندگی کو لنگڑی کسر کا سوال سمجھ کر حل کرنے بیٹھیں گے تو ان کو قدم قدم پر

ایسے ہی منازل سے گزرنا پڑے گا۔ لہذا یہ چیز کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کے بعد جب میں پانچویں جماعت میں آیا تو میرے ماموں مولوی رئیس احمد صاحب عباسی مرحوم جو سلطانپور میں بحیثیت منصرم ملازم تھے میرے کفیل و سرپرست ہو گئے والد نے مرتے وقت میرا اور میرے بھائی بہنوں کا ہاتھ پکڑ کر اُن سے کہا تھا کہ اب ان کی زندگیاں تمہارے سپرد ہیں ان کا ذہنیا کوئی نہیں ایک سال ان کے ہمراہ سلطانپور میں رہا وہ مجھ کو اولاد کے مانند سمجھتے اور والدہ کو ان کی ذات کا بڑا سہارا تھا مگر شومئی قسمت سے ساتویں جماعت میں ان کی شفقت سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا

اس سہارے کے ٹوٹنے کے بعد اب جس طرف نظر دوڑاتا اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا گھبرا کر ٹیوشنوں کی دھن سمائی ساتویں جماعت کے طالبعلم کو بھلا ٹیوشن کون دیتا مگر جوئندہ یابندہ، میرا عقیدہ ہے اگر خلوص نیت سے کسی کام کی جد و جہد کا آغاز کیا جائے تو اس میں خدا اپنے بندہ کو مایوس نہیں کرتا آخر مجھے تین روپیہ ماہوار کا ایک ٹیوشن چھوٹے بچے پڑھانے کا مل گیا۔ اور اس طرح اسکول کی فیس کا انتظام ہو گیا۔ اور زندگی کی گاڑی آگے کی جانب رینگنا شروع ہوئی۔ ساتویں جماعت سے اخبار بینی اور دوسری اُردو کی کتابوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور باوجود مصروفیتوں کے مشاعروں میں بھی جانے لگا حضرت آرزو لکھنوی اس زمانہ میں میرے محلہ ہی میں مقیم تھے گرمیوں کی تعطیلات میں اُن سے فیض صحبت کا کافی موقع ملتا ان کے گرد و پیش شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ چنانچہ دوسروں کی دیکھا دیکھی خود بھی اُلٹے سیدھے شعر موزوں کرنے لگا اور حضرت آرزو کی اصلاح لے کر اپنی غزلیں اخبارات کو بھیجنے لگا، اس زمانہ کا صرف ایک شعر اب تک یاد ہے۔

ہچکیاں آئیں تو ہے حکم کہ فریاد نہ کر
آپ تو یاد کریں ہم سے کہیں یاد نہ کر

میری یہ غزل اخبار آفتاب سنبھل میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں وہ اخبار اب بھی نکلتا ہے یا بند ہو گیا۔ کیوں کہ یہ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے۔ اسی زمانہ میں میں نے اپنے محلہ میں معین الادب کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی تھی جس کے صدر حضرت آرزو لکھنوی تھے۔ اس انجمن کے ماہانہ مشاعرے ہوتے اور چونکہ سکریٹری یعنی خاکسار کو ٹیوشنوں وغیرہ سے دس بجے شب کو فرصت ملتی اس لیے عموماً اس کے جلسے دس بجے شب سے شروع ہوتے۔ ان ادبی صحبتوں سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ان سے میرے ادبی ذوق پر صیقل ہوتا گیا۔ اسی زمانہ میں ایک ہادی مل گیا یعنی سید ہادی حسین صاحب رضوی بی۔ کام جو آج کل راجہ صاحب محمود آباد کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں ان سے شناسائی ہو گئی چنانچہ ہم دونوں نے مل کر ایک کمپنی احمد اینڈ کو کے نام سے قائم کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کمرشل لائن پر ایک ماہانہ رسالہ "رسالۂ روزگار" کے نام سے جاری کیا۔ اس صورت سے زندگی کی تین کٹھن منزلیں ادا طے ہو گئیں۔

داستان طویل ہوتی جا رہی ہے اور مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اس آپ بیتی سے کہیں آپ اکتا کر کتاب ہی نہ رکھ دیں مگر حضرت عبادت بریلوی مسٹر حبیب احمد قدوائی، نسیم احمد صاحب اور میرے مخلص دوست مسٹر صباح الدین عمر ایم۔ اے جرنلسٹ گورنمنٹ یو۔ پی کا اصرار ہے کہ میں اس باب کو قدرے وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کر دوں تاکہ میری طرح اگر دوسروں کو خدانخواستہ ان حالات سے دوچار ہونا پڑے تو اُن کے لیے یہ داستان مشعل ہدایت ثابت ہو۔ احمد اینڈ کو جنرل مرچنٹس ہر قسم کی ضروری اشیاء باہر بھیجتے تھے۔ قبل اس کے کہ احمد اینڈ کو کے کاروبار کا ذکر کروں اس سلسلہ میں اس کی عمارت کا تعارف بھی آپ لوگوں کو

کرتا ہوں کاہے کو ایسے بزنس مین اور ایسی کمپنیاں آپ کی نظر سے کبھی گزری ہوں گی۔

جس عمارت کے گوشہ میں یہ "کمپنی" واقع تھی وہ ایک بوسیدہ مکان تھا جسے ایک صاحب کرایہ پر لئے ہوئے تھے اُس کے بالائی حصّہ میں وہ خود رہتے تھے اور نیچے ایک نہایت مختصر سی کوٹھری تھی جس میں دو دروازے لگا کر اُسے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس میں ایک میز، دو کرسیاں، ایک پلنگ، ایک صندوق اور میرے اسکول کی کتابیں تھیں یہ تھی، اس کمپنی کی کل کائنات اور کل پونجی۔ کمرہ کا ایک رخ تنگ گلی کی طرف تھا اس کمرہ پر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا تھا جس پر جلی حروف میں احمد اینڈ کو کی تختی لگی ہوئی تھی اور جس کو اخبارات میں اشتہار نکلنے سے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ میں اس "بلڈنگ" میں گھر سے باہر بارہ سال رہا ہوں۔ گرمیوں کے زمانہ میں شب کو گیارہ بجے ٹیوشنوں سے فراغت کرنے کے بعد پلنگ میز اور کرسیاں سڑک پر نکال لیتا اور دو بجے رات تک اپنے کالج کا کورس پڑھا کرتا۔ کمرہ کا کرایہ کچھ نہ دینا پڑتا تھا کیونکہ جو صاحب اس کمرہ کے بالائی حصہ کو کرایہ پر لئے تھے ان کے ایک عزیز کے بچہ کو میں نے الف بے سے مفت پڑھانا شروع کیا تھا اس وجہ سے کہ اس بچہ کے والدین بہت پریشان حال تھے۔ تار کا کارخانہ تھا جس میں یافت بہت کم ہوتی۔ پورے خاندان میں چونکہ کوئی انگریزی پڑھا لکھا نہ تھا اس لئے بچہ کے والدین میرے اس پڑھانے کو اپنی جگہ پر بہت بڑا احسان تصور کرتے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ایف۔ اے تک پڑھ گیا۔ اس کا ہائی اسکول کا نتیجہ جس روز شائع ہوا ہے میں نہیں بتا سکتا کہ میرے دل نے کس قسم کی مسرت محسوس کی۔ آج کل وہ ایک فوجی دفتر میں سو سوا سو روپیہ کا ملازم ہے اور اس کے والدین ابتک مجھے بہت مانتے ہیں۔ پھر اُس بچہ کے والدین کا بچہ کو پڑھانے کا انہماک بھی قابل قدر ہے میری پڑھائی چونکہ ساڑھے دس اور گیارہ بجے شب سے شروع ہوتی تھی اس لئے

ماں باپ بچے کو ۱۱ بجے شب تک بہلا اور پھسلا کر اس خیال سے جگائے رکھتے کہ پڑھائی کی ناغہ نہ ہو یہ تھی احمد اینڈ کو کی 'بلڈنگ' اس سلسلہ میں بعض لطائف بھی آپ کی طبیعت کا بار ہلکا کرنے کے لیے سناتا چلوں۔ اس کمپنی کے قیام کے دوران میں دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کمرہ کا قفل ٹوٹ گیا۔ چارپائی اٹھ گئی، شیر دانی غائب ہو گئی۔ ایک مرتبہ تو عین کڑکڑاتے جاڑوں میں سوائے میلے کپڑوں اور کتابوں کے بقیہ کل سامان حتیٰ کہ چپل تک چوری ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نخاس سے پرانا فوجیوں کا کوٹ اور نیش گنج سے پرانے جوتے خرید کر گذر کرنا پڑی اور بستر نہ ہونے کے سبب دو تین ہفتہ تک صرف کرسیوں کو برابر رکھ کر اور اپنے اوپر میلے کپڑے ڈال کر سونا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسویں جماعت میں عین امتحان کے زمانہ میں منھ سے خون آنے لگا مگر زندگی کا باقی تو وہ قادر مطلق ہے جس نے مجھ پر آئنی ذمہ داریوں کا بار ڈالا تھا اور ان کے اٹھانے کی بھی پوری قوت عطا کی تھی۔ موضوع کا رخ کدھر سے کدھر ہو گیا۔ احمد اینڈ کو کا قصہ بیان کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ جی ہاں تو اس احمد اینڈ کو سے باہر کے لوگ جو سامان منگاتے ان میں ایک بزرگ کنور اعتماد علی خاں صاحب تھے جو سعد آباد ضلع فیض آباد اجودھیا میں تھے معلوم نہیں اب کس حال میں ہیں کوئی بڑے زمیندار یا تعلقدار تھے حقیقت اور مدینہ میں کمپنی کے اشتہارات نکلتے تھے۔ ان کو اس کمپنی سے کچھ غائبانہ سی عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ لکھنؤ کی تمام مشہور چیزیں مجھ ہی سے منگواتے حتیٰ کہ شادی بیاہ کا سامان ہگیی پان، فاختائیں، آم خربوزے غرض جس چیز کی ان کو ضرورت ہوتی وہ اس کا آرڈر احمد اینڈ کو بھیجدیتے۔ اس صورت سے تقریباً سو سوا سو روپئے ماہوار سے زائد سامان ان ہی کو جاتا۔ اس بزنس کے علاوہ میں نے، لومڑی سیار اور سانپ وغیرہ کی کھالوں اور ترکاریوں کا کاروبار بھی چھیڑ دیا۔ محلہ میں ایک کبڑیا بدلو نامی رہتا تھا اکثر میرے پاس وہ اپنے انگریزی کے تار اور خطوط پڑھوانے آتا یہ شخص باہر

سے کمیشن پر ترکاریاں منگا کر فروخت کرتا تھا۔ پنجاب میں ایک شخص کالا سراج نامی کوئی بڑا بیوپاری تھا اس کا پتہ بدیو کے تاروں کے ذریعہ مجھے معلوم ہو گیا تھا چنانچہ احمد اینڈ کو کی طرف سے اس سے پھلیوں کی تجارت شروع کی مگر چونکہ اس تجارت میں سرمایہ کی کافی ضرورت تھی اس لئے اس کو زیادہ عرصہ تک چلانا دشوار ہو گیا۔ محلہ نخاس میں اس زمانہ میں ریلوے بکنگ آفس تھا اکثر ایسا ہوا کہ بغل میں کالج کی کتابیں دبی ہوئی ہیں اور رفاختیاؤں کا پنجرا ہاتھ میں ہے جس کو بک کرانا ہے۔ اس کاروبار کی وجہ سے پڑھائی میں زیادہ ہرج ہونے لگا تھا اور میرے پیش نظر مقدم پڑھائی تھی اس لئے یہ سوچ کر کہ پہلے پڑھ لیا جائے اس کے بعد اگر کوئی معقول صورت نہ نکلے تو تجارت شروع کی جائے ہر کاروبار کے لئے سرمایہ مقدم ہے چنانچہ سردست کاروبار کو روک دیا اور پھر ٹیوشنوں کا سلسلہ شروع کیا یہ ۳۰-۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے جب میں ایف اے کے پہلے سال میں تھا۔ اسی زمانہ میں ایک ٹیوشن سید یوسف علی صاحب پروپرائٹر ہیویٹ انجینیرنگ اسکول لکھنؤ کے یہاں پچیس ۲۵ روپے ماہوار کا مل گیا اور دو ٹیوشن پندرہ پندرہ روپئے ماہوار کے اور مل گئے جس میں ایک صاحب ایسے تھے جو ریلوے کے دفتر میں ملازم تھے ان کے پڑھانے میں ایک زحمت یہ تھی کہ ان کے پاس سویرے سے دس گیارہ بجے رات تک کوئی وقت ایسا نہ تھا جس وقت وہ سکون کے ساتھ پڑھتے اس لئے یہ طے ہوا کہ شب کو چار اور پانچ بجے سے پڑھایا جائے۔ اس کے لئے وہ راضی ہو گئے۔ احمد اینڈ کو کے پاس ہی رہتے تھے۔ رمضان کا زمانہ تھا اس لئے سحر کے وقت سے سویرے تک پڑھانے کے لئے ان کا ٹیوشن کر لیا۔ اس ٹیوشن کے بعد صرف تین گھنٹے سونے کو ملتے مگر زندگی کی گاڑی کو کھینچنا تھا چنانچہ تین سال تک اس طرح زندگی گذاری۔ شروع سے کم سونے کا عادی ہونے کے سبب نتیجہ یہ ہوا کہ اب شب کو نیند اسی وقت آتی ہے جس وقت کہ اٹھنے کی طبیعت عادی ہو چکی تھی۔ چنانچہ آج کل بھی جو مضامین لکھنے یا مطالعہ کرنے کا وقت ہوتا ہے وہ

۱۱ بجے شب سے ایک دو بجے تک کا ہوتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ میں خاصے ٹیوشن مل گئے تھے۔
جس سے بھائی بہن کی تعلیم گھر کے اخراجات اور کالج کی فیس نکلنے کے بعد اتنا جمع ہو گیا کہ اس سے
اپنا ایک ذاتی مکان محلہ میں بنوا لیا۔ ایف۔ اے میں قاضی سر عزیز الدین احمد صاحب مرحوم دیوان
دتیا نے بھی ایک وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ایف اے پاس کر کے اخبار حقیقت میں
اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گیا۔ جو اخبار کسی زمانہ میں گلی کوچوں میں پھیری لگا کر فروخت کرتا تھا اس
میں بحیثیت جوائنٹ ایڈیٹر نام آنے لگا۔ اس درمیان میں سیاست سے اس قدر دلچسپی
بڑھ گئی کہ رات دن اخبار بینی اور مضمون نویسی کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہ رہا حقیقت میں
میں خبروں کے علاوہ مزاحیہ کالم بھی میرے ذمہ تھا۔ لکھنؤ سے اس درمیان میں ایک طویل
افسانہ گلابی ہیرا کے نام سے شائع ہوا تھا اس میں سات لکھنے والے تھے حضرت عبدالمومن
عشرت لکھنوی جواب انتقال کر گئے۔ جناب فدا علی صاحب خنجر۔ بہزاد لکھنوی، ظفر عباس صاحب
فضل ایڈیٹر نظارہ لکھنؤ۔ حضرت ہدایت اجتہادی۔ پروفیسر اکبر علی ایم۔ اے اور خاکسار۔ اس طویل
افسانہ کا ایک ایک باب ہر شخص نے لکھا ہے۔ ٹائٹل پر ساتوں لکھنے والوں کی ایک تصویر
ہے۔ یہ افسانہ اب بازار میں نہیں ملتا صرف ایک کاپی بطور یادگار میرے پاس محفوظ ہے۔
اس زمانہ میں میں نے جو افسانے لکھے وہ اودھ اخبار لکھنؤ۔ ریاست دہلی وغیرہ میں شائع
ہوئے ہیں۔ اسی درمیان میں راجہ صاحب کٹرہ کا پرائیویٹ سکریٹری ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء
کا ہے جبکہ صوبائی انتخاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں نئی نئی جماعتیں سیاسی اور مذہبی چولے
بدل بدل کر سیاسی میدان میں گامزن ہو رہی تھیں۔ انھیں جماعتوں میں یو۔ پی کے سرمایہ دار
اور تعلقداروں نے ایک جماعت اگری کلچرسٹ پارٹی کے نام سے قائم کی تھی راجہ بھینوڈیال
سیٹھ اس کے جنرل سکریٹری تھے ان راجہ صاحب کو ایک ایسے اخبار نویس کی ضرورت تھی

جو ان کی جماعت کے پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ ان کے حلقۂ انتخاب میں جگہ جگہ تقریریں کر سکے۔ اس کے لئے اس خاکسار کا انتخاب ہوا۔

میں اس کام کے لئے ہرگز موزوں نہ تھا۔ اول یہ کہ میں سیاسی حیثیت سے زمینداروں کے خلاف تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اگر خدانخواستہ اس جماعت کو الکشن میں کامیابی ہوگئی تو برسراقتدار ہونے پر یہ حضرات پورے صوبہ کے نظام کو مفلوج بنا دیں گے کیونکہ ان حضرات کی ہر ہر سانس سرکار پرستی کے لئے وقف ہے۔ دوسرے یہ کہ دیہات میں رہنا میرے لئے ایک مستقل کوفت تھا طبیعت کے اس تضاد پر آپ ضرور ہنسیں گے مگر اس تضاد کے علاوہ اور بھی بہت سے حیرت انگیز تضاد آپ کو مجھ میں ملیں گے۔ مثلاً یہ کہ میں کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتا۔ جاڑا، گرمی، برسات بغیر ٹھنڈے پانی سے نہاتے کھانا نہیں کھاتا۔ ایک دو بجے شب سے پہلے سوتا نہیں۔ بہرحال عم محترم مولوی انیس احمد صاحب عباسی کے اصرار پر مجھے یہ عہدہ قبول کرنا پڑا۔ مگر تین مہینے بعد دیہاتی ماحول سے تنگ آکر میں نے اس مصیبت سے نجات حاصل کی اور زبردستی استعفا دے کر پھر اخبار میں واپس آگیا۔ ع

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت

مگر اخبار میں آنے کے باوجود آگے پڑھنے کی آرزو دل میں ہنوز زندہ تھی پانچ چھ سال اخبار کا کام کرنے کے بعد اس آرزو کی تکمیل ہوئی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے میں نے بی اے پاس کر لیا۔ اسی درمیان میں اڈیٹر صاحب حقیقت نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار "کریسینٹ" کے نام سے جاری کیا تھا جو دو سال زندہ رہ کر مسلمانوں کی غفلت اور لاپرواہی کا شکار ہو گیا۔ اس کے ادارہ میں بھی مجھے دو سال کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں اپنا ذاتی اخبار بھی نکالنے کی دھن سمائی چنانچہ صداقت ہفتہ وار کے نام سے میں نے ۱۹۳۷-۳۸ء میں اپنا اخبار نکالا جو دو سال چلا۔

رہا۔ یہ خالص ادبی اور علمی پرچہ تھا جس کو صرف دو سال ادبی خدمت کا موقع ملا۔ اسی درمیان ۲۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو ایک ایسا اندوہناک واقعہ پیش آیا جس نے کچھ دن کے لئے میرا دماغ بالکل ماؤف کر دیا۔ اس واقعہ کا اثر دماغ سے ہنوز مندمل نہیں ہوا۔ اسی درمیان میں ایک اور مصیبت پیش آئی میرے چھوٹے بھائی احمد توفیق سلمہٗ کو گردن توڑ بخار ہو گیا، حالت اس درجہ ابتر ہوئی کہ کنگ جارج میڈیکل کالج میں داخل کرنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے مایوس ہو کر تقریباً جواب ہی دیدیا تھا۔ وہاں گردن توڑ کے چھبیس مریض اور تھے جو یکے بعد دیگرے ختم ہو گئے تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں

دوائیں ختم، دعا ختم چارہ گر مایوس
ترا کرم مرے پروردگار باقی ہے

روپیہ پاس نہیں۔ ڈاکٹروں نے قیمتی انجکشن تجویز کئے۔ والدہ کا رنج و غم سے یہ عالم کہ گھر سے کپڑے پھاڑ کے نکلی جاتیں۔ دماغ ماؤف تھا کہ روپیہ کہاں سے آئے۔ اتنے میں اسٹنڈرڈ جرمن انشورنس کمپنی جس کا کہ اس زمانہ میں میں انشورنس ایجنٹ تھا اس کے ڈائرکٹر اکیس ہزار کے مل گئے۔ دونوں صاحبوں نے سال سال بھر کا یک مشت پریمیم ادا کر دیا جس پر تقریباً ساڑھے تین سو روپے مجھے کمیشن کے مل گئے۔ انجکشنوں کا انتظام ہو گیا اور رفتہ رفتہ میرے بھائی کو شفا ہو گئی۔ اس کے بعد کی داستان قدرے اس سے زیادہ پر مصائب ہے ۱۹۳۵ء میں ہی کریسنٹ بند ہو گیا اور اسی کے ساتھ سا تھا مدد و اخبارات کی مالی حالت اس درجہ سقیم ہو گئی کہ طبیعت اخبار نویسی سے اچاٹ ہو گئی۔ دل نے کہا مستقبل تاریک ہے کوئی دوسری راہ اختیار کرو چنانچہ یہاں سے نکل کھڑا ہوا اور کٹنگ کا کام پرائیوٹ طریقہ پر سیکھ لیا۔ رات رات بھر جاگ کے پینٹ، کوٹ، قمیص، برجس غرض سول اور ملٹری سب ہی قسم کے لباس کاٹنا سیکھ لئے اور شاہجہاں پور کی کلوزنگ فیکٹری میں سی کلاس کا سپروائزر ہو گیا۔ یہاں تین شفٹ ہوتے تھے رات کو دشوار گزار راستوں سے گھر آنا پڑتا اکثر لوٹ مار قتل و غارت کی واردا تیں بھی ہو جاتیں نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی ملازمت ترک

کرکے میونسپل بورڈ شاہجہاں پور میں فوتی پیدائش کا کلرک ہوگیا اور ایک ٹیوشن آفتاب احمد خاں ڈپٹی کلکٹر کے یہاں کرلی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں شادی کے بعد سکریٹریٹ میں آگیا۔ اس ملازمت میں بھی ہفت خواں کی منزلیں طے کرنا پڑیں اردو اور انگریزی دونوں ٹائپ سیکھ کر چار چھ مہینہ قسمت آزمائی کرنے کے بعد جگہ ملی۔ گزشتہ سال لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیوٹ ایم اے پاس کیا ہے۔

خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ابھی تک زندگی کی کسی جد و جہد میں مجھے مایوس نہیں ہونے دیا۔ اس وقت ماشاء اللہ میرے چھوٹے بھائی احمد توفیق سلمہٗ کا اپنا خاصہ کاروبار ہے اور چار پانچ سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے۔ چھوٹی بہن کو ایف۔ اے تک تعلیم دلاکر اس کی شادی کردی ہے۔ زندگی کی آنے والی منزلیں اب کتنی طے کرنا ہیں اور ان کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی کتنی توانائی جسم میں باقی ہے اس کا علم خدا کو ہے ؎

اسیر ہے روزِ مجبوری یہ سوچ کے حیرت ہوتی ہے
جو بوجھ اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے

(وحشت کلکتوی)

یہ تو تھیں وہ ہفت خواں کے ابتدائی منازل جن سے زندگی کے گذشتہ تیس سال میں مجھے دوچار ہونا پڑا اور یہ زندگی کے وہ پہلو تھے جو عبرتناک بھی تھے اور تاریک بھی۔ دردانگیز بھی تھے اور سرور آمیز بھی۔ جن میں مصائب بھی تھے اور آلام بھی صعوبتیں بھی تھیں اور تکلیفیں بھی مگر اب جب ان طے کی ہوئی منزل کی طرف نظر موڑ کر دیکھتا ہوں تو دل ایک خاص قسم کی مسرت اور خوشی سی محسوس کرتا ہے مگر اب بھی منزل کا کوئی یقین نہیں۔ خیر ان خرافات کو چھوڑیئے یہ تو ہر انسان کی زندگی کے ساتھ ہیں کسی کے ساتھ کم اور کسی کے ساتھ زیادہ۔ اب

مدآوا کی ترتیب کے بارے میں مجھے چند باتیں عرض کرنا ہیں۔ مدآوا میں درحقیقت بہت سی خامیاں ہیں۔ کچھ میری مصروفیتوں کے سبب اور کچھ میری ناتجربہ کاری کی بنا پر یقین مانیئے کہ دوستوں سے مشورہ تو درکنار اس پر نظرثانی تک کا بھی موقع کس کم بخت کو ملا اور اسی وجہ سے اس میں بہت سی خامیاں رہ گئیں۔ بہرحال اس کے آئندہ اڈیشن میں آپ اس کو بہت سی خامیوں سے پاک پائیں گے۔ پہلا اڈیشن تقریباً ختم ہو چکا ہے اور دوسرا اڈیشن میں محض رائیلٹی پر دینے کو تیار ہوں۔ مدآوا پر اس وقت تک جو جو اعتراضات ہوئے ہیں ان میں سب سے پہلا اور بدترین اعتراض تو یہ ہے کہ وہ محض صوبائی تعصب کی بنا پر لکھی گئی اور اس میں یک طرفہ بندوق چلانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا مقصد اہل پنجاب کو دکھ پہنچانا ہے حالانکہ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ میں اس قسم کے تعصبات سے بالکل پاک ہوں۔ مدآوا میں جن جن ادباء اور شعراء کا ذکر ہے ان کی قدر و منزلت میرے دل میں یو۔ پی کے ادباء اور شعراء سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ درحقیقت پنجاب اردو ادب کی جو خدمت گزشتہ دس سال سے انجام دے رہا ہے اس کے مقابلہ میں یو۔ پی اس سے کہیں پیچھے ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اہل پنجاب ہی کی ذات سے آج ہندوستان کے گوشے گوشے میں اردو ادب زندہ ہے اور جس قدر معیاری کتابیں ہر سال اس صوبہ سے شائع ہوتی ہیں اس کے مقابلہ میں حیدرآباد بھی اس سے پیچھے پڑ گیا ہے۔ گزشتہ چوتھائی صدی میں اگر آپ دیکھیں گے تو پنجاب نے اردو ادب میں ایسے ایسے انشاء پرداز، افسانہ نگار اور شاعر پیدا کیے جن کا جواب ہندوستان کا کوئی دوسرا صوبہ نہیں دے سکتا۔

مدآوا کا مقصد محض اصلاحی اور تعمیری تھا تخریبی ہرگز نہ تھا جیسا کہ بعض مخالفین نے

سمجھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے طنز میں جگہ جگہ شدت پیدا ہو گئی جس کا میں خود بھی معترف ہوں اور اس کے لئے میں اپنے ان ادبا سے بے حد معذرت خواہ ہوں جن کو اسے پڑھکر صدمہ ہوا یا جنھوں نے اس کے طنز کو اپنی تذلیل اور تحقیر پر محمول کیا۔ بخدا میرا مقصد ہرگز ان کی تذلیل اور تحقیر نہ تھا۔

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
سچ کہتا ہوں کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نارَوا کی اشاعت اسی اصلاح کی ایک دوسری کڑی ہے۔ اس میں آپ ہندوستان کے ان نظم آزاد اور نظم معریٰ لکھنے والوں پر مزاحیہ تبصرہ پائیں گے جن کا کلام مختلف رسائل اور مجموعوں میں اب تک میری نظر سے گذرا ہے اور بعض جن پر میری نظر کتاب چھپنے وقت پڑی ان کا تذکرہ انشاءاللہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں کروں گا۔ نارَوا میں بھی اگر بعض بعض جگہ میرے طنز اور تبصرہ میں آپ کو شدت معلوم ہو تو اس کو میری ادب دشمنی کے بجائے ادب دوستی پر محمول فرمائیں اور اس پر ریویو کرتے وقت آپ شوق سے مجھے ٹوکیں اور مشورہ دیں۔ طنز کوئی تخریبی چیز نہیں ہے۔ میری دانست میں تو ادب میں طنز ہی ایک بہترین اصلاحی آلہ ہے کنھیا لال کپور کی طنز نگاری کا میں بے حد دلدادہ ہوں اور مجھے ان کی طرز نگارش بے حد پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب میں تنقید لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ طنز نگار بھی بڑھیں اور یہ چیز ہمارے ادب کی بہت بڑی خوش قسمتی ہو گی۔

نارَوا کے بعد میرا ارادہ ہے کہ "پھسلن سے لحاف تک" کے عنوان سے ایک تیسرا مجموعہ شائع کروں جس میں بعض افسانہ نگاروں کے افسانوی ادب پر طنز ہو۔ امید ہے کہ آپ میری اس حقیر کوشش پر بہ نظر اصلاح نگاہ ڈالیں گے اور مجھے اپنے مفید اور کارآمد مشوروں سے

سرفراز فرمائیں گے۔

اس سلسلہ میں مجھے اپنے بعض مخلصین کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس کی ترتیب میں مجھے مشورے دئے ہیں جن میں خصوصیت سے حبیب احمد صاحب قدوائی سید اعظم حسین صاحب اعظم اڈیٹر سرفراز، مسٹر نسیم احمد، مسٹر صباح الدین عمر، جناب عبادت بریلوی، ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی شمیم کرہانی صاحب اور حضرت اختر تلہری کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اس سلسلہ میں میری ہمت افزائی فرمائی۔

غلام احمد فرقت
مصطفےٰ منزل نادان محل روڈ
لکھنؤ

اختر الایمان

آپ یو۔ پی کے رہنے والے ہیں۔ نام امیر المومنین قسم کا ہے کلام سے پنجاب کے پیغمبر معلوم ہوتے ہیں آپ کی نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دریائے راوی کی لہروں کو لاکر دریائے گنگا میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ مصرعوں کے ترنم میں اگر ایک جگہ کچے گانے کا لطف آتا ہے تو دوسری جگہ ستار کی آواز کا لوچ دار ابہام جگہ جگہ سماعت کو ٹہوکے دیتا چلتا ہے۔ ایک ادیب کا خیال ہے کہ آپ "انسان سے زیادہ شاعر ہیں" گویا انسانیت کم ہے۔ یہ نتیجہ غالباً آپ کی بعض ایسی نظمیں پڑھ نکالا گیا ہے جہاں اختر ایسی باتیں کرتا نظر آتا ہے جیسی کہ اکثر چھوٹے بچے جھولے میں تنہا بیٹھکر دیواروں سے کیا کرتے ہیں واقعتاً اگر آپ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو بیشتر ایسے بچکانے خیالات ملیں گے جنھوں نے سن بلوغ کو پہونچکر نظموں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کلام میں جذباتی دباؤ۔ گھلی ہوئی سپردگی، ہری ہوئی ذہنیت، برمائی ہوئی یاسیت پائی جاتی ہے جس سے پورا کلام زنجیروں کا ماتم کرتا نظر آتا ہے کسی کسی نظم میں رسیلہ طنز بھی ہوتا ہے مگر ایسی نظمیں بہت تھوڑی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی شاعری ابھی سن بلوغ کو نہ پہونچنے پائی تھی کہ اس کے پیٹ میں گرداب آگیا ورنہ اگر ان کی شاعری کو ابھی مزید جوان ہونے کا موقع دیا جاتا تو اس کے اور زیادہ رنگ و روپ نکھرنے کی امید تھی بہرحال ان کی آزاد

نظم کی لیلیٰ جب الفاظ کی ساری زیب تن کرکے خوبصورت عنوانات کے ساتھ رسائل کے صفحات پر رقصاں نظر آتی ہے تو بہت سے نوجوان تو آوازے کس کے کلیجہ تھام لیتے ہیں البتہ بعض "جہلا فہم کے ادیب بلا ضرورت ان پر قہقہے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

آمادگی

ایک اک اینٹ گری پڑتی ہے
سب دیواریں کانپ رہی ہیں
ان تھک کوششیں معماروں کی
سر کو تھامے ہانپ رہی ہیں

موٹے موٹے شہتیروں کا
ریشہ ریشہ چھوٹ گیا ہے
بھاری بھاری تنہا پتھر
اک اک کرکے ٹوٹ گیا ہے

لوہے کی زنجیریں گل کر
اب ہمت ہی چھوڑ چکی ہیں
حلقہ حلقہ چھوٹ گیا ہے
بندش بندش توڑ چکی ہیں

اِحتشام حسین رضوی

ترقی پسندوں کی شاعری آپ کو اچھے اتو کہکر پکارتی ہے کچھ ان کی تنقید کے ڈر سے اور کچھ ان کے غیر معمولی سنجیدہ ہونے کے سبب آپ نے "ترقی پسند" اور "غیر ترقی پسند" ادب کے انگریزی اور اردو دونوں کلاموں کا اتنا وسیع مطالعہ کیا ہے کہ اگر کبھی کبھی شعر کہنے کو دل بھی چاہتا ہے تو کوئی مفرد لفظ اپنی نظم کے عنوان تک کو نہیں ملتا تخیل کا معدہ اس قدر چالو قسم کا واقع ہوا ہے کہ ہر چیز

ہر چہ در کان نمک رفت نمک شد

ہو کر رہ جاتی ہے۔ "ترقی پسندوں" میں اگر کوئی نقص ہوتا ہے تو ان کا دل نہیں میلا کرتے بلکہ بعض اوقات اُن کے نقص سے اس طرح چشم پوشی کرتے ہیں جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو پہلی مرتبہ بڑی پیتے دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہو۔ بیشتر پابند شعر کہتے ہیں کبھی کبھی نظم معریٰ بھی محض "رجعت پسندوں" کو جلانے کے لئے کہہ دیا کرتے ہیں کیسی زمانہ میں دل میں محبت کی شدید" موج "آگئی تھی جس کی چمک اب بھی ایسے زمانہ میں ہوتی ہے جس زمانہ میں آپ کا شعر کہنے کو دل چاہتا ہے۔ ترقی پسندوں میں کتابیں خریدنے اور پڑھنے یا تو ان کو دیکھا یا عبادت بریلوی کو۔ شعر پڑھتے وقت آواز میں اتنا درد ہوتا ہے کہ سننے والے بھی اپنی مرحوم محبت پہ ہاتھ پڑھنے لگتے ہیں۔ گفتگو میں متانت اور ذہانت گنگا جمنی کا کام کرتی ہے۔ "تصویر کے دھندلکے میں" بتائیے تو کون سی پہیلی بجھائی ہے؟

تصویر کے دھندلکے میں

شام کی راہ پہ جلنے لگے تاروں کے ایاغ
اب بھی دھندلے ہیں مگر میرے تصور کے نقوش
جیسے پائے نہ کوئی راہِ محبت کا سراغ

سُرخ تحریر پہ جس طرح سے پانی پڑ جائے
نقش جمتا بھی نہیں شکل بدلتی بھی نہیں
ڈوبتی بھی نہیں یہ ناؤ سنبھلتی بھی نہیں

اور یہ کون چلا آتا ہے کمزور نزار
اس کو تو چھوڑ کے زنداں میں ابھی آیا ہوں
اس کا پیغام بھی سلمیٰ کے لئے لایا ہوں
اب تو سلمیٰ نہیں پہنچاؤں یہ پیغام کیسے
چھوڑ سکتی ہے بھلا گردشِ ایام کیسے

احمد ندیم قاسمی

جب کوئی نام نہاد مولوی کسی مرغن دستر خوان پر پہونچ جاتا ہے تو وہ پینترے بدل بدل کر اپنی جولانیٔ طبع کے زبردست مظاہرے کرنے لگتا ہے۔ اور مختلف زاویوں سے پلیٹوں پر دیوانہ وار شب خون مارنا شروع کر دیتا ہے اور ہر چیز پہ چشم زدن میں حضرت بی بی کی جھاڑو پھیر دیتا ہے۔ آج کل کے شعرا میں احمد ندیم قاسمی کو بجائے معدہ کے قدرت کی طرف سے کچھ اسی قسم کا چوڑا چکلا دماغ ودیعت ہوا ہے چنانچہ یہ بھی جب کسی موضوع پر کہنے کو آتے ہیں تو پھر دنیا اور مافیہا سے بے نیاز ہو کر اس وقت تک اس کا پنڈ نہیں چھوڑتے جب تک کہ اس کی معنویت چیں نہ بول جائے۔ ابلیس سے لیکر رحمٰن تک یہ دست درازی کرتے ہیں اپنی آزاد یا پابند نظم کو خواہ وہ کتنی مادر زاد بھدّی قسم کی کیوں نہ ہو رسائل کی پالی میں لاکر ضرور چھوڑتے ہیں خواہ ان میں سے بیشتر فش کر کے راہ فرار ہی کیوں نہ اختیار کر لیتی ہوں" ابلیس رات کے سناٹے ہیں" بڑی نفیس قسم کی نظم ہے جس کو پڑھ کر جوش کے حرف آخر کے ٹکڑوں کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ افسانہ نویسی اور شاعری دونوں اس تیزی سے کرتے ہیں کہ متھرا کے چوبے اس رفتار سے لڈو نہیں کھا سکتے۔ ہر ششماہی ایک عدد مجموعے سے دنیائے ادب کو نواز رہے ہیں غرض آپ نے اپنی دماغی کائنات کے جملہ حقوق شعر و شاعری اور افسانہ نگاری کے نام وقف کر دئے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ فرماتے چلیے۔

اس کو افلاس کے نرغے میں پھنسائے رکھو
اس کو تقدیر کا محکوم بنائے رکھو
کھیت پک جائیں تو دھتکار دو کتے کی طرح
اگلے موسم کے تقاضوں سے لُبھائے رکھو
اس کی امید طلسمات کی زنجیریں ہوں
اس کے احساس کی شمعوں کو بجھائے رکھو
جن کے فیضان سے مضبوط ہے بدعت کا نظام
اُن روایات کا دیوانہ بنائے رکھو
یہ نہ مانو تو امیروں کا لہو گرماؤ
ورنہ خود اپنے جہنم میں بھسم ہو جاؤ

ابوالفضل صدیقی

قلم کی نب خراب تھی، اس کو درست کرنے کے لئے کاغذ پر چند بے ربط فقرے لکھنا شروع کر دئے۔ بعد میں نب بھی درست ہو گئی اور ایک عدد آزاد نظم بھی تیار ہو گئی۔

دو رنگ

اے شکاری دوست
تو دراصل ہے روحِ روانِ زندگی
آگ لگنے والی بندوقیں تیری
ہیں تیرے منہ میں کبھی
حیواں کبھی، انساں کی بچی بوٹیاں
آہ یہ تیری دو رنگی زندگی

احمد مجتبیٰ وامق

فطرت نے شاعر بنایا تھا اور قسمت نے وکیل - دونوں کی بات رہ گئی
حالات نے کتر بیونت کرکے - اے - آر - او - اور نیم آزاد شاعر بنا دیا -
آجکل صبح بنارس مین شام اودھ بنے ہوئے ہین وقت کی تنگی کے
سبب اب آزاد شاعری زیادہ کرنے لگے ہیں -

اور مصرعوں کو الفاظ کا راشن بقدر جثہ تقسیم کرتے ہیں - کلام میں سیاست
اور رومان ہوتا ہے مگر ابہام کی جانبی دونوں کو پوری نظم میں اٹھا بیٹھی کراتی معلوم ہوتی
ہے - بعض نظموں میں پورے پورے بند کو مرغا بنا دیتے ہیں - وہ آزاد نظم جو خود
وامق صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی اس کو ترقی پسند رسائل میں چھپنے بھیجدیا کرتے
ہیں اور ارباب ذوق والے اپنی "خوش ذوقی" کے ثبوت میں اسکو سال کی
بہترین نظموں میں جگہ دے دیا کرتے ہیں - اگر یہ اپنی وہ قوت جو آزاد نظم پر صرف
کرتے ہیں اپنی انہیں غزلیات پر صرف کرتے تو ادبی محفلوں میں ان کو مجاز کے
برابر جگہ مل جاتی مگر آزاد نظم نے ان کی شہرت کی پکی پکائی ہانڈی میں لینڈی
نکال کر رکھ دی بعض غزلیں اتنی بلند پایہ ہیں کہ ان کو پڑھنے سے سیری نہیں ہوتی
مگر یہ باتیں ہیں جب کی جب آتش جواں تھا -

سردست آزاد نظم کی پہیلیاں زیادہ بجھاتے رہیں - نمونۂ کلام ملاحظہ ہو -

"فرار"

ریگ ساحل سے جو اُٹھتی ہے بگولہ بن کر
اپنی دوشیزگی و رقص کا طوفان لئے
سرنگوں ہو کے کسی دشت سے جا ملتی ہے
راہ میں لغزشِ قدم روپ بدل دیتے ہیں
کس لئے شام و سحر رہتے ہیں سرگرمِ خرام
نہ کبھی دیکھتے ہیں مڑ کے نہ تھکتے ہیں کبھی
ایسے بیکار سوالات میں کیا رکھا ہے ؟
چاند کو چھونے کی بے سود تمنائے حسیں
ایک طفلانہ تجسس کے سوا کچھ بھی نہیں

اعجاز بٹالوی

بہت خوشگوار شاعر ہیں۔ پابند نظمیں نہیں کہتے محض آزاد نظم کو چھومنتر کہکر رسالوں میں بھیجدیا کرتے ہیں مگر ان کے اس چھومنتر میں کبھی اعجاز مسیحائی والی شان کارفرما نظر آتی ہے۔ زبان اور خیالات دونوں ڈال کے ٹوٹے ہوئے پکے اور رسدار ہوتے ہیں الفاظ کی نشست و برخاست میں ادب برائے ادب کا لحاظ رکھتے ہیں نہ عمور جالندھری کی طرح عورت کے ازاربند اور شلوار پر نظر ڈالتے ہیں اور نہ میراجی کی طرح دستِ خود دہانِ خود کے قائل۔ اگر آپ ان کے نظم کے مصرعے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں تو آپ کو محبت اور جذبات کی وہی دھڑکنیں محسوس ہونگی جو مستی کے عالم میں ایک کبوتر کے محبت بھرے دلمیں ہو جیسی مارتی ہیں فلمی دنیا میں اگر ان کی نظمیں بجائے ڈراموں کے اسٹیج کی جائیں تو ہر فلم لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے ڈراموں سے زیادہ مقبول ہو۔ ان کی آزاد نظمیں ان کی معری نظموں کے جھرمٹ میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے فلم میں یک بیک کوئی مزاحیہ ایکٹ شروع کردیا جائے۔ زندگی کا اتنے قریب سے مطالعہ کیا ہے کہ روزمرہ کی زندگی کے جس پہلو کا بھی ذکر کرتے ہیں آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ انکی بدترین نظم پڑھکر بھی انسان کو کم از کم اتنی مسرت ضرور محسوس ہوتی ہے جتنی کہ ایک چیچک رو انسان کو میک اپ کرنے کے بعد آئینہ میں اپنی صورت دیکھکر۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

بلوط کے سبز سبز پتوں پہ چاندنی مسکرا رہی ہے
بلوط کی اِک بلند چوٹی پہ چاندنی کا حسین دامن اٹک گیا ہے
گھنیرے سایوں کی اوٹ لیکر سکوت کبھی سو گیا ہے شاید
کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی موجوں پہ ٹہنیاں سرسرا رہی ہیں
کئی بہاریں گذر چکی ہیں کہ چاندنی کا حسین آنچل
بلوط کے مسکراتے۔ پتوں کے نیچے رک کر
بہار کے گیت گا رہا تھا۔

الطاف گوہر

آزاد نظم اور نظم معریٰ دونوں کہتے ہیں۔ ان کی آزاد نظم کا ایک مصرعہ دوسرے مصرعہ کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس طرح ایک بھنگا دوسرے بھنگے کو دیکھتا ہے۔ الفاظ نرم اور لوچدار استعمال کرتے ہیں۔
"تمہارے آنسو" جب ان کی تخیل کے چوہے دان میں پھنس جاتے ہیں تو ان بدنصیبوں کو بری طرح گو برسنگھا سنگھا کر مارتے ہیں نظم کے عنوانات بڑی مشکل سے ہاتھ پیر جوڑ کر اپنی جان چھڑا پاتے ہیں۔ یہ آنسو کا ابتدائی ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

نگاہوں میں لپٹے ہوئے سرخ ڈورے
سیاہی کی بے خواب لہروں میں ڈوبے
مجھے کیا فسانے سنانے لگے ہیں
یہ رکتے ہوئے اور بہتے ہوئے اشک کیا کہہ رہے ہیں
یہ کس کی ندامت کے غماز ہیں
کس کی بھولی ہوئی دل سے اتری ہوئی
مضمحل یاد شاداب کرنے لگے ہیں
لرزتے ہوئے آنسوؤں میں پشیمانیاں کھل رہی ہیں

پشیمان ہو تم پشیمان ہو تم
تمھاری ندامت کے آنسو
مجھے بھی رُلانے لگے ہیں مرا ضبط و صبر آزمانے لگے ہیں
خدارا انھیں پونچھ ڈالو
یہ کب تک لرزتے لرزتے ڈھلکتے رہیں گے
یہ کب تک یونہی بھولی بھالی سی صورت بنا کر
سسکتے رہیں گے بلکتے رہیں گے
انھیں پونچھ ڈالو کہ مجھ میں نہیں تابِ نظارہ باقی

آدا بدایونی

یہ بھی آزاد نظم اور نظم معریٰ لکھتی ہیں تخیل بڑے پاٹ دار اور تعزیتی خیالات پیدا کرتی ہے ان کے اشعار پڑھ کر بعض اوقات رونا آتا ہے۔ دوسروں کے خیالات بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنا لیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ خیالات کا آٹا گوندھتی ہیں اس کے بعد ان کی لوئیاں بناتی ہیں اور اسکے بعد چھ چھ چپاتیوں کے جوڑے بنا کر نظم مکمل کر لیتی ہیں"۔ ترقی پسندوں کی "ادھر اُدھر کی باتیں" ان کو پھوٹی آنکھوں نہیں بھاتیں۔ شاعری میں صنفی کمزوریاں جگہ جگہ چھلانگیں مارتی نظر آتی ہیں۔ تشبیہات میں ایک خاص قسم کی ندرت موسیقیت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ بعض مصرعوں میں تو ایسی ایسی ادائیں کوندتی نظر آتی ہیں کہ بقول جوشؔ

یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

نظم کی سیڑھیاں چھوٹے بڑے سائز کی ہوتی ہیں جن پر پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی بخیریت نام نیچے اتر آتی ہیں۔ سماج کی زیادتیوں کا شکوہ اس طرح ڈرتے ڈرتے کرتی ہیں جس طرح کوئی مغربی خاتون اپنے شوہر کے سامنے اپنی شادی سے پہلے کی باتیں بیان کرے۔ ان کی نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

یہ مرے دل کو خیال آتا ہے

موت کے سایہ تلے سسکیاں بھرتی ہے حیات
اس امنڈتے ہوئے طوفان سے کنارہ کرلوں
یہ سسکتی ہوئی لاشیں یہ حیات مردہ
یہ جبینیں جنھیں سجدوں سے نہیں ہے فرصت
یہ امنگیں جنھیں فاقوں نے کچل ڈالا ہے
یہ بلکتی ہوئی روحیں یہ تڑپتے ہوئے دل
یہ ترستی ہوئی نظریں یہ ڈھلکتے ہوئے اشک
ان ڈھلکتے ہوئے اشکوں کو چرا کر میں بھی
اپنے ایوان تصور میں چراغاں کرلوں

ابن مسعود

ابن مسعود یعنی کم و بیش ابن سعود - حجاز کے ابن سعود یہودی جکاری کے جرم میں بدوؤں کے ہاتھ پیر کٹوا لیتے ہیں یہ ہندوستان میں مصرعوں کے ہاتھ پیر کٹواتے ہیں۔ نظم کے پابند مصرعے ان کو دیکھ کر اس طرح ڈرتے ہیں جیسے بچہ گھوڑے چڑھائی سے قبل حجام سے - باپ ابن سعود کی قدامت پسندی اور یہودی ٹنیزم کے اس قدر مداح تھے کہ بیٹے کا نام والیٔ حجاز کے نام پر ابن مسعود رکھ دیا مگر قدرت کی ستم ظریفی نے صاحبزادے کو "ترقی پسند" بنا دیا یہ جو سات چھوٹی بڑی لکیریں آپ نیچے اِدھر اُدھر پھدکتی دیکھتے ہیں۔ یہی اُن کی شاعری ہے کلام میں کلبلاہٹ پائی جاتی ہے کل نظم اپنی بچھلی ٹانگوں سے اپنے کیے پر خاک ڈالتی چلتی ہے۔

ر. ب. بسیرا

لچکتی شاخیں

رسیلی دنیا
رسیلی دنیا لچکتی شاخوں پہ جھولتی ہے
یہ ڈگمگاتی حقیقتیں بھی اسی کی شاخوں پہ جھولتی ہیں
یہ سب طیورِ شکستہ پر بھی لچکتی شاخوں پہ جھولتے ہیں
لچکتی شاخیں، چمکتے تاروں کی نیم روشن سیاہ خلاؤں ہیں، جھولتی ہیں۔
یہ جھلملاتی رسیلی دنیا کی داستان ہے۔
مگر ادھوری ——————

انجم رومانی

نام ثریا رومانی اور سیتا راقسم کا ہے عورتوں میں جنت مکانی کے ہم وزن ہیں اور مردوں میں ڈاکٹر مانی کے ہم قافیہ۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

زنانہ اور مردانے دونوں مشاعروں کی صدارت اپنے نام کے بل بوتے پر کرسکتے ہیں نظم معریٰ اور نظم آزاد ادب لطیف قسم کی کہتے ہیں۔ اشعار میں "بنداذیت"[1] کو زیادہ دخل ہے۔ نظم ہلکی پھلکی ہوتی ہے۔ خیالات اور الفاظ دونوں میں جدت پائی جاتی ہے۔ بہت سی ابہامیہ نظمیں ایسی کہہ دیتے ہیں کہ ان کا مطلب کر دینے کے بعد بھی ہاتھ نہیں آسکتا۔ ان کی نظم "گذر رہے ہیں گذرنے والے" کے مصرعوں کو اٹھا کر دیکھیے ان میں کوئی مطلب تو نہیں دبا پڑا ہے! اور اگر ہے تو آپ ہی بتائیے کیا ہے؟

گذر رہے ہیں گذرنے والے ÷ لرزنے والے لرز رہے ہیں

لرزتے جھونکے

گذرتے بل کھاتے، رینگتے سرسراتے جھونکے

نسائی ملبوس کی طرح سرسرانے والے ــــ

کڑکنے والی کی چابکوں سے

اگرچہ دود رواں کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔

مگر نظر جس طرف بھی اٹھتی ہے دیکھتی ہے۔

گذر رہے ہیں گذرنے والے۔

[1] بنداذیت [illegible]

بشیر ساجد

آزاد نظمیں اس لئے لکھتے ہیں تاکہ لوگ ترقی پسند کہیں اور آپ یہ کہکر مسکرا دیں کہ "میں کس قابل ہوں"۔

خس و خاشاک میں بکھرے ہوئے سانپوں کے ڈھانچ
اور اک ڈنڈ پہ الّو کی نشست
وہ خرابوں کا وفادار الست
جس کو تفویض ہوئی شورش تخریب جہاں

باقر رضوی

کچھ لوگ سگین سے چڑھتے ہیں اور آپ آزاد نظم کی ہمین گکڑیوں سے گھبراتے تھے۔ چنانچہ آپ کی پابند شاعری نے ایک زمانہ میں آزاد نظم کا حقہ پانی تک بند کر رکھا تھا مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت دن بعد ترقی پسندوں کی اِس قسم کی نظموں سے آپ کی بول چال شروع ہو گئی ہے آدمی ذہین۔ شعر کم کہتے ہیں مگر جو کہتے ہیں انمیں معنویت ہوتی ہے ابہام نہیں ہوتا مگر۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ آپ کی پابند نظموں اور غزلوں میں سیاسی اور سماجی چرخ چل ضرور رہے ہیں اور ان کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ادبی میلہ میں گوناگون چیزوں کے مظاہرے ہو رہے ہیں کہیں محبت کے چرخے چل رہے ہیں تو کہیں معاشرت کی اصلاح پر دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں کہیں، وعظ ہو رہا ہے تو کہیں رتن بائی اپنی موسیقی کے کمالات دکھا رہی ہیں، کہیں سوز ہے تو کہیں ساز، کوئی درد میں تڑپ رہا ہے تو کہیں دنیا کے مصائب و آلام پر قہقہے لگ رہے ہیں۔ غرض کہیں بجتے ہیں نقارے کہیں ماتم بھی ہوتے ہیں، کلام میں مباسیت بھی ہے اور رجائیت بھی مگر ان تمام چیزوں پر جدت کا صیقل اور معنویت کا رنگ چڑھا ہوا ہے اس "نئے دور" میں آپ کی شاعری اٹھکھیلیاں کرتی نئے دور سے گزرتی تانیں لگاتی چلی جاتی ہے۔ مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود شاعر صاحب کا تخلص اس درجہ عبرتناک اور غیر شاعرانہ واقع ہوا ہے کہ آپ کا خیال آتے ہی لکھنؤ کے

آغا باقر کے امام باڑہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ شعر اس طرح پڑھتے ہیں جیسے چھوٹی لائن کا انجن پانی لینے کے بعد شنٹنگ کرتا ہے۔ بعض اشعار میں کوٹ کوٹ کر سیاست ہی سیاست بھر دیا کرتے ہیں۔ آپ کی آزاد نظم کے دو تین ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

"یہ خیالات کی نازک پریاں"

یہ خیالات کی نازک پریاں
جو مرے ذہن کی پہنائی میں، تیرتی پھرتی ہیں پر تولے ہوئے
جیسے کوئی سیمیں کشتی چاندنی رات میں
بہتی ہی چلی جاتی ہو، بادباں کھولے ہوئے
ایک سوئے ہوئے گمنام جزیرے کی طرف
کہ جسے خوابِ شبینہ کا مزا یاد نہیں
———— ایک بے نام جزیرے کی طرف
جس کا کوئی ماضی ہی نہیں
ایسا ماضی
کہ جہاں چند شباں
شاد و فرحاں
ہانکتے پھرتے ہوں بھیڑوں کے ہزاروں گلے
خشک و ویران چراگاہوں میں

تاثیر (ڈاکٹر)

شاعر بھی فلسفہ کے ڈاکٹر بھی اور حکومت ہند کے محکمۂ نشریات کے ایک صیغہ کے افسر بھی۔ یک نہ شد دو شد بلکہ سہ شد۔ نئے ادبی تجربوں کے سبب اپنے گروہ کے رہبر بالِ اجارہ معلوم ہوتے ہیں۔ نئے نئے تجربے پیدا کرنے میں آپ پر ایسی غنودگی طاری ہو جاتی ہے جیسی کہ بچہ کی ولادت کے بعد عورت پر۔ اِس غنودگی میں اپنے اور غیر کے تخیل کا امتیاز بھی بےحد دھندلا پن کر رہ جاتا ہے۔ خیال سے قالب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں انقلاب کی قطع تاریخ بھی خاصی اچھی کہہ سکتے ہیں۔ شاعرانہ تجربوں میں جمالیاتی عنصر کی چاشنی ہوتی ہے آپ کے "رس بھرے ہونٹ" ملاحظہ ہوں۔ اس میں آپ بڑی دور تک بغیر کسی ارادے کے چلے گئے ہیں۔ ترقی پسندوں کی دنیا میں ان کے "رس بھرے ہونٹوں" کی بڑی دھوم ہے اس کی ایک قاش آپ بھی چکھ سکتے ہیں۔

رس بھرے ہونٹیا
پھول سے ہلکے
جیسے بلور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفق صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کے ڈھلے

تابش صدیقی

آپ کی آزاد نظم کی تاریکی میں بعض خیالات اس طرح چمک اٹھے ہیں جیسے گھنگھور گھٹا میں بجلی۔ معمولی پیاس میں کھٹے لیموں کا شربت پیکر جو ذائقہ زبان کو حاصل ہوتا ہے وہی اُن کی نظم بلینک ورس کے بعض ٹکڑے پڑھ کر ہوتا ہے اگر پابند نظم لکھیں تو خاصی اچھی لکھ سکتے ہیں۔

کتنی چپ چاپ ہے کوچے کی دھواں دھار فضا
سو رہی ہوگی کسی گوشہ میں وہ مینا بھی
سینکڑوں جام ابھی جس نے لنڈھائے ہوں گے
اور اک جام بلوریں بھی کسی قالیں پر
یاد میں محفل دوشینہ کے روتا ہوگا۔

تاراچند بتّی

جب آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ حضت آپ اس قدر کم نظمیں کیوں فرماتے ہیں تو بڑے تکلف کے بعد گھما پھرا کر بولے کہ جو کچھ کہتا ہوں اُس میں سے کبھی یاران طریقت ایک آدھ مصرعہ اڑا لیتے ہیں چنانچہ سلام مچھلی شہری صاحب نے

ساحل اک دھندلے سے جالے کے سوا کچھ بھی نہیں

کا دو تہائی حصہ چرا کر نظم مکمل کر لی نام سے کو مسلم ترقی پسند معلوم ہوتے ہیں کیونکہ آزاد نظموں کے میلے ٹھیلوں میں بھی آپ کا کلام بہت کم نظر آتا ہے۔ کلام میں کوئی شرم وحیا نظر نہیں آتی ممکن ہے کہ صاحب کلام میں ہو ان کی نظمیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے ابہام پرست شاعر اسٹیفا میلارمے کی شادی کا سہرا پڑھا جا رہا ہے۔

یاس

دل ناکام ہیں دوشیزہ تمناؤں کا رقص
ڈوبتی کشتی میں چند اور سوار آئے ہیں
دام گرداب بلا دوری ساحل: طوفاں
میری اُمید مرا رخت سفر

پھر فضا پر ہے محیط
یاس کی بڑھتی اُمنڈتی ہوئی گھنگور گھٹا
کہکشاں ڈوب گئی تھم گیا رقص تمناؤں کا
تھم گیا رقص تمناؤں کا

حد ادراک سے دور
دور اُس کشمکش پیہم سے
ساحل اک دھندلے سے خاکے کے سوا کچھ بھی نہیں

تصدق حسین خالد (ڈاکٹر)

آپ کی شاعری ترقی پسندوں کی بھارت ماتا معلوم ہوتی ہے بہت پڑھے لکھے پرانی ٹکسال کے جدید ترقی پسند شاعر ہیں آپ ہیں اور ن ۔ م ۔ راشد ہیں آزاد نظم کی ولدیت پر سخت لاگ ڈاؤنٹ چل رہی ہے دونوں اپنے کو والد کہتے ہیں موصوف صرف حسن و عشق ہی سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ دنیا کے خیالات اور واقعات سے بھی متاثر نظر آتے ہیں آزاد نظم ہم سے پوچھتی ہے کہ وہ کس کو ابّا کہکر پکارے

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ان کی نظم کتبہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو جو در اصل ابو نواس کے اس شعر کا ترجمہ ہے جو اس نے اپنی قبر پر کتبہ کرانے کے لئے لکھا تھا اور جس کا مطلب یہ ہے کہ غلطی میرے باپ نے میرے ساتھ کی مگر میں نے کسی کے ساتھ نہیں کی ۔ مگر کسی کی قبر پر سے کتبہ گھما دینا تو کوئی بات نہیں آزاد نظم کے گڑ بڑ جھالا پارک میں تو ایسی چیزیں آئے روز ہی ہوا کرتی ہیں ۔

شیر دل خاں

میں نے دیکھے تیس سال
پے بہ پے فاقے

مسلسل ذلتیں

سو رہا ہوں اس گدھے کی گود میں
آفتابِ مصر کے سائے تلے
میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی
رُت کنوارا
کیا کہوں .....

جیلانی کامران

عروض سے بے حد ناراض ہو کر انھوں نے آزاد نظم کی صورت پھو کنا شروع کر دی ہے ضیاء الاسلام قسم کے شاعر ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اگر وہ اسرافیل ہیں تو یہ میکائیل دونوں اپنی نظموں کو ایک بحر میں نظم کرتے کرتے بحر کی دوسری پٹری پر اتر آتے ہیں مگر یہ ان سے زیادہ بھیانک قسم کی آزاد نظم لکھتے ہیں۔ آزاد نظم کے فارسی میں ترجمے اچھے کر سکتے ہیں اگر ان سے پرانے وصیت ناموں کا آزاد نظم میں ترجمہ کرایا جائے تو وہ بھی لاجواب رہیگا۔

رافیل

ذوقِ رافیل کی تخلیق یہ تصویر!
ذوقِ رافیل ــــــ فرستادہ مریم کا اسیر
معبد پطرس اعظم کے لئے رنگ تراش
وضع مریم کا شبیہ!
در بہ در ۔ قریہ بہ قریہ
یہ تلاش بے سود!!
کاش تمثیلِ مکمل کا نشاں مل جائے۔

جگن ناتھ آزاد

آپ آزاد نظم پر اس طرح سوار ہو کر شعر فرمانا شروع کر دیتے ہیں جیسے کسی عورت پر شیخ سدو۔ مصرعے بڑی بھیانک اور لایعنی چیخیں نکالتے ہیں آج تک آپ کے دائروں کا مفہوم سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ کلام میں مفہوم کے سوا باقی سب کچھ ہوتا ہے۔

دائرے

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حد نظر
اجلے اجلے
دھندلے، دھندلے
مٹتے مٹتے دائرے

حسن فراز

برعکس نام تہہ ندزنگی کا فور۔ کلام میں نشیب۔ اور نام میں فراز۔ آزاد نظم میں اچھے خاصے نشیب و فراز معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ شاعری کے ساتھ مذاق کرتے ہیں یا شاعری ان کا مذاق اڑاتی ہے بہرحال جس ستم ظریف نے بھی ان کو شاعر بنا دیا ہو اُس کا خدا بھلا کرے۔

کلام پڑھنے کے بعد دماغ وہی لذت محسوس کرتا ہے جو جڑ میٹھی مولی کا پانی پی لینے سے محسوس ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کا ایک مصرعہ دوسرے مصرعہ سے سالے بہنوئی والا مذاق کرتا ہوا چلتا ہے۔ عجب نہیں جو یاران طریقت زنگی نظموں کے سلسلہ میں بھی یہی کرتے ہوں۔ خودکشی والی نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی کسی نظم کے پیجامہ سے ازار بند نکال کر اُس کو ڈھیلا باندھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

خودکشی

اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ رہا ہوں اپنا
موت کے سرد شکنجے میں جکڑتی ہوئی رات
ایسی آئی ہے کہ پھر جا نہ سکے گی شاید
صبح کا وہم بھی ہے ذہن پہ اب بارِ گراں
یہ لرزتے ہوئے تارے یہ سیاہی یہ خلا
افق حزن پہ ہے اس کی یہ دھندلی سی لکیر

راجہ مہدی علی خاں

اگرچہ آدمی جوان ہیں مگر کلام میں ستر سالہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی طرح طنز بے حد لطیف کرتے ہیں۔ سماج کے مطالعہ میں اتنی محنت کی ہے جتنی کہ ایک طبیب حاذق کسی مریض کا قارورہ دیکھنے میں کرتا ہے۔ طنز نگاری میں جدّت کے ساتھ ساتھ کافی جاذبیت پائی جاتی ہے۔ ان کی بعض طنزیہ نظمیں پڑھ کر انسان اس طرح پھڑک جاتا ہے جس طرح بھاپنس کی کھٹک سے کوئی دوشیزہ۔ زبان پر بے حد قدرت ہے۔ بعض نظموں میں لکھنوی تکلفات اچھلے پڑتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

مضراب

جی پہلے آپ
"اجی رکھیے جنت کے در میں قدم!"
اجی پہلے آپ
"اجی واہ پہلے نہ جائیں گے ہم
نہیں پہلے آپ!"
اجی بات اس میں تکلف کی کیا
قدم مبارک بڑھائیں ذرا
اجی پہلے رک جائے گی سب جگہ

"اجی پہلے آپ"
بھئی پہلے آپ
"اجی بڑھ کر بھی چلئے خدا کے لئے
سبھی اب تو جنت میں ہیں جا چکے
تکلّف کو اب بر طرف کیجئے
نہ اب مجھ سے کہئے خدا کے لئے
اجی پہلے آپ!"
عنایت ہے شفقت ہے یہ آپ کی!
مگر مجھ سے یہ تو نہ ہوگا کبھی!
تکلّف کی اللہ حد ہے کوئی!
یہیں پر کھڑی ہوگئی اک صدی!
بس اب پہلے آپ!"
"اجی پہلے آپ!"
ار ... ہو گیا بند جنت کا در
خدایا بتا جائیں اب ہم کدھر
نہیں واپسی کے سوا کچھ مفر
چلو بھائی واپس چلیں اب مگر
"ذرا پہلے آپ!"
اجی پہلے آپ!"

ساقی

عمر خیام کے محبوب اور ہمارے آپ کے ترقی پسند شاعر ساقی بڑے گھر کی بن بیاہی لڑکیوں والی شاعری کرتے ہیں از ار بندی مصرعہ عموماً بڑا لکھ کر مطالب کو پائچوں میں گھر س لیتے ہیں۔ کلام میں سرعت اور تندی کو زیادہ دخل ہے۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ملاقات

شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم سے لئے
جیسے دو پتّے لچکتی شاخ سے
ٹوٹ کر گر جائیں سطحِ آب پر
زندگی یہ زندگی
ہاں یہ ظالم زندگی
جس کی طوفاں خیزیوں سے ایک موجِ تند و تیز
لے گئی تم کو بہا کر میری آنکھوں سے بھی دور

ساحر لدھیانوی

ایک عدد مجموعے کے آباجان جناب ساحر لدھیانوی "رجعت پسندوں" اور "ترقی پسندوں" دونوں گروہوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں رومان اور دل میں محبت کی ٹیس چٹکیاں لیتی رہتی ہے محاکات کے بادشاہ ہیں بعض نظمیں اس قدر رنگین ہوتی ہیں کہ محمد علی شاہ رنگیلے کے زمانہ کی یاد تازہ کر دیتی ہیں بعض نظموں میں ابہام اور جدت اس طرح ایک دوسرے سے گلے ملتی ہیں جیسے ایک ماں کی چہیتی بیٹی سسرال سے واپسی پر اپنی ماں بہنوں سے بغل گیر ہوتی ہے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور غزلوں میں بھی معنویت کے ساتھ ساتھ اچھوتا پن ہوتا ہے۔ کہیں کہیں زبان پکار پکار کر کہتی ہے کہ "ہمارا ملک پنجاب ہے۔ بعض نظموں کے پورے پورے بند عشاق کی ڈائریوں میں لکھ لینے والے ہوتے ہیں۔ کلام میں پختگی کے ساتھ ساتھ لومڑی کی کمر کی سی لچک ہوتی ہے۔ ہر مصرعہ میں معنویت کی دوشیزہ ایک بڑا اچھوتا لے کر ان کی ہراس والی نظم آخری بند کو گاتی ملتی ہے۔

ہراس

سوچتا ہوں کہ تجھے مل کے میں جس سوچ میں ہوں
پہلے اس سوچ کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں

٦۵

میں ترے شہر میں انجان ہوں پردیسی ہوں
تیرے انداز کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں
کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرّا جائیں
اور تری مرمریں باہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارہ نہ ملے

سبطِ فیضی

کلام میں "حل کردہ، صاف نمودہ، عقبِ آں بنوشند" والی بات پائی جاتی ہے۔ بیشتر مصرعے اُمیدوں سے معلوم ہوتے ہیں اور پڑھنے والا ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ جیسے تخیل کو بھی نیند سے جگا دیا گیا ہے۔ اسلامیہ کالج جالندھر میں صدرِ شعبۂ فارسی ہیں۔ آزاد نظم کے لٹو کو ابہام کی چٹکی سے نچاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دس پانچ چکر کاٹنے کے بعد نظم کا لٹو جھوم کر ایک طرف لڑھک جاتا ہے۔ بعض مصرعے ابہام کے انڈے سیتے ملتے ہیں۔ کلام میں اُوپری دھڑ کا جنسی ابھار پایا جاتا ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست میں اعصابی کمزوریاں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہیں ——— مصرعوں کے جسم میں ابہام کی جونکیں لگا کر ان کا ناقص خون چسواتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کلام کا بہت سا زندہ خون بھی چس جاتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

زمین کے سینۂ پُرسوز کا مہیب اُبھار\
رکدھر سے توسنِ گیتی پہ چڑھ کے آئے سوار\
یہ سر کشیدہ پہاڑ !!\
جلے تجھے سے ابھی جلنے والے جلتے ہیں

سردار انور

کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترکی اور فارسی شاعری نے ساجھے میں آزاد نظم کو گھر بٹھالیا ہے تنقیدی مضامین لکھنے کے لئے بہت سی صلاحیتیں ودلیت ہوئی تھیں مگر ان صلاحیتوں کو اس طرح آزاد نظم پر صرف کرتے ہیں جس طرح کسی امیر گھرانے کا منچلا لڑکا کالج کی فیس سینما بازی پر صرف کر دیتا ہو۔ آدمی پڑھے لکھے اور سخن فہم ہیں مگر اپنے وسیع مطالعہ سے ناجائز فائدہ اٹھاکر شاعری شروع کر دی ہے۔ اگر کوئی بےجھجک بحر نظم آزاد کے لئے مل جاتی ہے تو اس کو کبھی اندھیرے اُجالے استعمال کر لیتے ہیں نظمیں زیادہ تر پابند لکھتے ہیں۔ مصرعوں کی عمریں متوسط درجہ کی ہوتی ہیں۔ بےجھجکانے مصرعوں پر وقت نہیں ضائع کرتے۔

کچی کلیاں کام کی ہوتی نہیں
کیوں مرا جاتا ہے کمسن کے لئے

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

ڈانس ہال

ریشمی کرنوں نے ہر سمت بچھائے جالے
تتلیاں آتی رہیں، پھنستی رہیں اڑتی رہیں
اور کبھی پھول کھلے اور کبھی پھیلے سائے
میری بانہوں کے سہارے یہ وہ چنچل آنچل
تیرتی پھرتی تھی جس طرح ہوا میں خوش بو
جھیل کی موجوں پہ لہراتا ہوا نیل کنول

سید محمد جعفری ایم۔ اے

عجب نہیں جو سید محمد جعفری نام اور ایم۔ اے تخلص ہو۔ اور دو تین مضامین
میں ایم۔ اے کر کے ایک کو بطور تخلص استعمال کرتے ہوں۔ بے حد ہنس مکھ
شاعری کرتے ہیں۔ مصرعے ترنم بخش قہقہوں میں بود و باش اختیار کئے نظر آتے
ہیں۔ آزاد نظم اور نظم معریٰ کو ادبی ڈھیا ڈھیکر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے
طنزیہ شاعری میں آپ خود اپنی نظیر ہیں۔ جدید شعرا کو نظم آزاد میں کبھی ڈانٹ
دیا کرتے ہیں۔ ظرافت ان کی تخیل کی دودھ شریکی بہن معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ کو
لونڈی غلاموں کی طرح پال رکھا ہے زبان کا ہر فقرہ موکل کی طرح ہاتھ باندھے
کھڑا رہتا ہے۔ کلام میں شگفتگی اور آئس کریم والی فرحت بخش مٹھاس پائی جاتی ہے
ہر مصرعہ آزاد نظم سے محاکات کا جزیہ وصول کرتا چلتا ہے سنگلاخ سے سنگلاخ
زمین کو بھی ظرافت کے ایٹم بم سے اڑا دیا کرتے ہیں۔ رہنے سہنے کا طریقہ نہایت
شاعرانہ اور ادیبانہ ہے۔ ادبا کے بڑے قدر داں ہیں۔ یہ اور ان کا کلام آپکو
محکمۂ اطلاعات عامہ دہلی میں مل سکتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جدید شاعری

طرز نو کی شاعری میں مدو جزر د بحر و شعر
اُف غضب

ایک مصرعہ فیلِ بے زنجیر کی زندہ مثال
دوسرا اشتر کی دم
طرزِ نو کی شاعری کی کوئی کل سیدھی نہیں
شہر بھر میں اونٹ بے چارہ عجب بدنام ہے
آہ اونٹ

شاعری کیا ہے سمجھ لیجئے کہ ہے بالکل ربڑ
کھینچئے سے کھنچ جاتی ہے چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

سعید احمد اعجاز

آزاد نظمیں رفتار زمانہ سے متاثر ہو کر کہتے ہیں مگر پابند نظمیں بڑی حمیڑی اور جاندار لکھتے ہیں۔ نظم معریٰ میں

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال

والے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جدید شاعری کا مذاق اڑانے کی غرض سے آزاد نظمیں کہتے ہوں۔ کیونکہ نمونۂ کلام کچھ ایسے ہی "معنی خیز" اشارے کرتا معلوم ہوتا ہے۔

کاش میں جب ایک رات
شدتِ غم میں نکل جاتا کبھی بستی سے دور
تو مرے خوابوں کے رنگین گھر میں آجاتی وہاں
چاندنی کے نور کا باریک آنچل سائے
میرے عارض کی تجلی سے ابلتا چشمۂ نور وضیاء
اور سحر تک داغ ناکامی کا دھونے کے لئے
اس کی لہروں میں اکیلی غسل کرتی میری روح

شمیم کرہانی

ہندی اور اردو دونوں کے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ قسم کے شاعر شمیم کرہانی نہ کسی کے شاگرد ہیں اور نہ کوئی شاگرد ان کو استاد بنانے کا متحمل ہو سکتا ہے کیونکہ شعر کو بہت اونچے سے پرکھتے ہیں۔ بہت ذہین ہیں سِن بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی نہایت بالغ اور معمر شعر کہتے ہیں۔ جب پان چبا کر اور سگرٹ کے دو تین کش لگا کر قلم دوات سے کچھ لکھتے دکھائی پڑیں تو سمجھ لیجئے کہ کوئی معیاری نظم لکھ رہے ہیں ورنہ نظم آزاد تو عموماً پنسل ہی سے لکھ مارتے ہیں۔ ان کی سنہ ۱۹۴۲ء کی نظموں کو جو "روشن اندھیرے" کے نام سے شائع ہوئی ہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا ہنگامہ ان کی چارپائی کے گرد ہو رہا تھا اور یہ آنکھ بند کئے اس سے متاثر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ "ترقی پسندوں" کی طرح متاثرانہ زندگی بسر کرتے ہیں ایک بیوی کی معرفت مبلغ دو عدد بچوں پر اس طرح قانع ہیں گویا رستم کی قبر پر لات مار کر بیٹھے ہیں۔ نہ کافی ہاؤس جاتے ہیں اور نہ "ترقی پسندوں" کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے "ترقی پسندوں" اور "رجعت پسندوں" کے درمیان ان کی نظموں کی حیثیت ایک گھنٹہ گھر کی سی ہے جسے دیکھ کر نوجوان شعراء وقت کا اندازہ کرتے ہیں ترانے اور برق وباراں دو کے باپ ہونے کے باوجود صورت سے نابالغ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گاندھی جی کہیں ان کو شعر پڑھتے دیکھ پائیں تو ہریجن کے اردو ایڈیشن کے جملہ حقوق ان کے نام محفوظ کر دیں کیونکہ ہندوستانی

زبان جس کو گاندھی جی را سخ کرنا چاہتے ہیں ان کی نظمیں اس کی صحیح آئینہ دار ہیں۔ ان کی نظموں کے سامنے بیشتر شعرا کی نظمیں اس طرح گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہتی ہیں جیسے ایک دیورانی اپنے جیٹھ کے سامنے۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

یہ مجسّمہ

یہ بت مرمریں
اس کے ہونٹوں کی سنگین سی اک کجی
جیسے آتی ہے نخوت میں ڈوبی ہوئی لب پہ سلطان کے فاتحانہ ہنسی
گفتگو طنز کی۔
ولولوں کے خدائے توانا ہیں ہم
فاتح بحر و بر اہرمن کی قسم
ہم نے انسانیت کے لہو سے جلائے ہیں اپنی خنک محفلوں میں کنول
وہ سنہرے کنول
جن کی مسموم لو ناگ کا سرخ پھن بن کے لہرا رہی ہے ابھی
زہر برسا رہی ہے ابھی
کتنی معصوم لاشوں کے انبار ہیں خاک پر
جن پہ رکھ کے قدم
ہم نے خود کو فضا میں کیا ہے بلند اور توڑے ہیں تاروں کے رنگین ثمر

شورش لکھنوی

کافی ہاؤس کی چلتی پھرتی "آزاد نظموں" کا تصوّر جب شب کے سناٹے میں بستر پر بے چین کرتا ہے تو اُس وقت مناجات کی شکل میں جو چیز ان کی زبان سے نکلتی ہے۔ اُسی کو یہ آزاد نظم کہہ کر دوستوں پر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا سکہ جماتے ہیں۔ کمیونسٹوں میں بھرا مار کر اڑتے ہیں مگر پَروں کی کمزوری کے سبب ترائے نہیں بھر پاتے مقامی ترقی پسندوں کی جلو میں دو ایک نظمیں جھاڑ کر روز کی روز دل کا بخار اتار لیا کرتے ہیں۔ کلام میں "کنوارے" الفاظ اور "ٹکسال باہر" ترکیبیں استعمال کر کے اپنی جدّت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور واہ واہ کا ٹیکس وصول کر لیتے ہیں نظموں میں جنسی بھوک کم اور "سامعین" آمیزی زیادہ ہوتی ہیں دوسروں سے زیادہ خود اپنے کلام سے متاثر ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

اڑان

راہ دکھلاتے ہیں جب شب کو فلک پر تارے
کارواں میرے خیالوں کے بھٹک جاتے ہیں
نیلے آکاش میں پر کھول کے اڑتا ہے سکون
وادیاں بانہوں کو پھیلائے ہوئے سوتی ہیں
سینۂ دشت پہ ابھرے ہوئے ٹیلوں کا سماں
مجھ کو اک لغزشِ نافہم پہ اکساتا ہے
دل میں نادیدہ تمنائیں ابھر آتی ہیں!
جیسے پتھر میں تراشے ہوئے دیرینہ خیال
جن کو فن کار کا ستھرا ہوا احساس کبھی
اپنے مچلے ہوئے جذبات میں چھو لیتا ہے

ش-م-اقبال

نام کیا ایک اچھی خاصی پہیلی ہے۔ شیخ محمد اقبال بھی ہو سکتے ہیں اور شبیہا محمودہ اقبال بھی ہو سکتی ہیں۔ کلام میں نسوانی بے قراریاں اور ادبی جھکاؤ پایا جاتا ہے شیعر اس لئے کہتے ہیں کہ تحت الشعور میں زیادہ انجارات جمع کرنے کی حکیموں اور ڈاکٹروں نے مخالفت کی ہے۔ تجمی عاشق ہیں، چنانچہ کلام میں محبت کی چاشنی بھی رسیلی ہوتی ہے البتہ طرز ادا کا چھلکا اس قدر موٹا ہے کہ کلام کا رس اندر ہی اندر خشک ہوتا چلا جا رہا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

میں پھرا کرتا ہوں شاموں کے دھندلکے میں اداس

اور حزیں . . . .

جب فضاؤں میں بچھے ہوتے ہیں غمگین سائے

انہی شاموں کے دھندلکوں میں کہیں

منتشر ہیں مرے رومانوں کے آثارِ حسیں

شریف کنجاہی

آزاد نظم لکھنے کے مستقل مرض میں مبتلا ہیں۔ کلام

چہ پروائے از دو دینار دارد   کہ دارالضرب در شلوار دارد

کا مصداق ہے۔ ان کی آزاد نظمیں بتاتی ہیں کہ بحث وحرکت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی مصرعوں میں روانی اور بہاؤ ہوتا ہے۔ کافی ہاؤس میں اگر ان کی کوئی نظم بہ آواز بلند پڑھی جائے تو سامعین کی شہوت نظر میں، ہاؤس کی ترقی پسند پڑھنیں پھینس سکتی ہیں۔ یونیورسٹی اور اسکولوں کے طلباء میں ان کا کلام کافی ہاؤس سے بھی زیادہ مقبول ہے۔ مصرعوں میں ابہام کی گدگدی جذبات کے گلے میں باہیں ڈالے نظر آتی ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

پسپائی

کیوں جگاتے ہو مرے سینہ میں امیدوں کو

رہنے دو اتنا نہ احساں کرو

میں تو کل آئی ہوں اور آتی ہوں دو دن کے لئے

کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی

اور پھر آنے کا امکان نہیں

اور یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں —

کیوں جگاتے ہو مرے سینہ میں امیدوں کو

صہبا لکھنوی

طبیعت نہایت دور مار پائی ہے۔ ہر صنف سخن کے معالج ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ویسیں میں ہوتے ہوئے بھی بدیسی ہیں یعنی مشاعروں میں کنٹرول ریٹ پر بھی نظر نہیں آتے۔ رسالوں میں البتہ کبھی آزاد نظم کی شلوار اور کبھی پابند نظم کا گھٹنا پہنے نظر آتے ہیں۔ شاعری کسی خاص نظریے کے ماتحت نہیں کرتے کلام میں الفاظ کا چناؤ بہت دلکش ہوتا ہے مگر اس کے باوجود پیتیہ وزم کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ کلام میں بالخصوص آزاد نظم میں مرثیے والی شان پائی جاتی ہے اور اگر زور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی لمسماۃ سوز پڑھ رہی ہیں۔

اوٹ

کوئی آہٹ کوئی آواز نہیں، کچھ بھی نہیں
جیسے بے روح سے ہنگامے سے بے جاں سا شور !!
موت کے پہرے، فضا چپ سی "ہوائیں ساکت"
کپکپاتا ہے شب تار میں خمینی کا دھواں !!
لرزشیں میرے تخیل میں خلاؤں میں دھمک
دھڑکنیں ڈوبتے تاروں میں میرا قلب تپاں
ظلمتیں سہمی ہوئی سہمی ہوئی میری نظر
تہ بتہہ لپٹا ہوا ذہن میں صدیوں کا جمود

ضیا جالندھری

جب سے ترقی پسندی کی ناگن نے آپ کی شاعری کو ڈس لیا ہے اُس وقت سے اُن کی آزاد نظموں کو اہریں آتی رہتی ہیں کلام پر ایک عجیب گم سُم کی سی کیفیت طاری ہے۔ "سریٹ نالے" "ڈلکی چال آ رہیں" "سوئی ہوئی بے چینیاں" وغیرہ قسم کے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ اس کو چاہے آپ شاعری سمجھیں یا ماتری بہرحال ایک زمانہ سے شاعر ہیں اور اب ترقی پسندوں میں جالندھر کا سکول نامزد کردہ نمائندے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

تجدید

خشک ہونٹوں پہ تبسم آیا۔
حلقہ در حلقہ نہیں سازِ الم کی موجیں
جاگتی لہروں کی انگڑائیاں بہتا ہوا راگ
راگ وہ راگ جسے دل سے دہراتے ہیں
کوئی کہتا ہے کہ اب خوابِ شب تار سے جاگ
دیکھ موجوں میں طلاطم آیا۔

ضمیر اظہر

کلام میں بڑے سائز کے مصرعے زیادہ ہوتے ہیں آزاد نظم کی خصوصیت غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ جو لکھ دیا شعر ہو گیا اور جو کہہ دیا نظم ہو گئی۔ آزاد نظم کہنے والوں میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انڈین نیشنل آرمی میں ایک پیدل سپاہی کی تھی کلام کے اندر۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

والی بات پائی جاتی ہے۔ شبِ گذشتہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

یاد ہے اب تک شب کا وہ طرفہ سماں
کیف و مستی کے حسیں سپنوں میں جب کھویا ہوا
اور تنہا ایک چشمے کے قریب
سبزۂ خود رو کے نازک سیج پر
ہاتھ میں بربط لئے
نغمہ ریزی میں ہمہ تن محو تھا۔

ضیا فتح آبادی

جب سے ان کو آزاد شاعری کے دورے پڑنے لگے اس وقت سے ان کی پابند شاعری ان کو چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی۔ تخیل کی صحت اس درجہ خراب ہو چکی ہے کہ بغیر جنسیات کا بیچارا لئے اس کو سکون ہی نہیں ملتا۔ کلام پر ہر دم عورت سوار رہتی ہے جس طرح ماں باپ اپنے بدصورت سے بدصورت بچے سے محبت کرنے پر مجبور ہے اسی طرح یہ اپنی ہر آزاد نظم کو نایاب اور حسین سمجھنے پر مجبور ہیں۔ شاعری برائے شاعری کے قائل ہیں۔

شیریں تلخی

میں گنہگار نہیں مجھ کو نتائج سے غرض
تو گنہگار رہے پل بھی تجھے تنہا ہی بھٹکنا ہوگا
میں نے تجھ کو کہیں دیکھا ہی نہیں
کس لئے میرے شبستاں میں چلی آئی ہے
لوٹ جا نیند نہ کر میری اچاٹ
صبح دفتر بھی مجھے جانا ہے۔

طالب شیرازی

آپ شیرازی ہیں مگر شاعری گرہ باز قسم کی کرتے ہیں بعض شعر قلابازیاں کھاتے ہوئے دور نکل جاتے ہیں۔ لاکھ بہکنے پر بھی اپنا گھر نہیں بھولتے۔ مصرعے محبت کی جمائیاں لے کر ادھر اُدھر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی گیت بھی کہہ لیا کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

سرد بھیگی ہوئی ہواؤں میں
تیری آنچل کی سلوٹوں کے نشاں
کسمساتا ہوا گداز بدن
نرم جھونکوں میں شعلۂ لرزاں
چاندنی رات کے حسین سائے

ظہیر الدین ایم۔ اے

غالباً آپ کوئی ثقیل قسم کا ناشتہ کرکے شعر کہنے بیٹھے ہیں کیونکہ ان کے تحت الشعور سے نکلا ہوا ہر مرد مجاہد مصرعہ نظم کے اکھاڑے میں لنگوٹ کسے یا علی حیدر کے نعرے لگا کر کلام کی رکھوالی کرتا معلوم ہوتا ہے۔ نثر میں کہانیاں اچھی لکھ سکتے ہیں مگر افسوس کہ زیادہ وقت نظم آزاد لے لیتی ہے۔

کلام میں ادبی "دباؤ"، لفظی "گھماؤ" اور تفریحی "جھٹک" پائی جاتی ہے۔
کہیے آپ کا کیا خیال ہے؟

ناکام

خاموش سی بے ضرر سی لڑکی
معصوم سی بھولی بھالی
تو جانتی ہے مجھ میں کیسی طاقت ہے
جان کو روندنے کی
تو جانتی ہے کہ تجھ کو مجھ سے
الفت ہے اور نہ میری پروا
پھر چھوڑ تو دوں جہان کو لیکن
کس آس پہ میں رہوں گا زندہ

ظہیر کاشمیری

اگر فلم میں چلے جائیں تو بیک وقت شاعر اسٹوری رائیٹر اور کچھ عرصہ میں خاصے ڈائرکٹر بن سکتے ہیں۔ ان کے کلام میں فلمی معنویت اور زباں میں لطیف قسم کی ہم آہنگی اور ترنم پایا جاتا ہے۔ فلمی دنیا میں ان کی وہی وقعت ہو سکتی ہے جو ایک قاضی کی کسی نکاح کی محفل میں آزاد نظم میں ڈائی لاگ بھی اچھے بول سکتے ہیں۔

قانون

سنو عدل یہ ہیں ظل اللہ
اور یہ ہیں ... غلاموں کے گروہ
یک بیک طوقِ سلاسل میں اسیر
ایک گھر انڈیل جو اُل آتا ہے
کانپتے ہونٹ قدم لرزیدہ
ہیبت شاہ سے تھراتا ہے
یہ وہ مجرم ہے کہ جس نے سرِ راہ
ایک صورت کا اڑایا تھا مذاق

عبادت بریلوی

اس لئے شاعری کرتے ہیں کہ بقول میاں فیل ڈکسن The poet who has not a critic in him is no poet, the critic who has not a poet in him is no critic

مگر اپنے کو شاعر کہتے اِس طرح آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں جیسے کہ ناکتخدا لڑکی اپنے منگیتر کا نام سن کر۔ غرض صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ نظم آزاد اور نظم معریٰ دونوں قسم کی نظمیں لکھتے ہیں اور بڑی دور تک اُن کو لنگڑی کسر کی صورت میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ البتہ اخیر یا درمیان میں کوئی ایسی پتہ کی بات بھی کہہ دیا کرتے ہیں جس سے پوری نظم میں چھپی ہوئی معنویت اس طرح تلملا اٹھتی ہے جیسے کسی کو بچھو ڈس لے۔ محبت سے کبھی کبھی اور سیاسی اُلجھنوں اور سماجی بندشوں سے بسا اوقات متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں اکثر نظمیں شہرت کے اندیشے میں دبلی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نثر بڑی لطیف لکھتے ہیں اور بڑے ہر جیسے قسم کے نقاد ہیں چنانچہ نقادوں کی ٹرین میں اپنی صلاحیتوں کا سامان سکنڈ کلاس ہی میں بُک کراتے ہیں۔ چال ڈھال اور بات چیت بھی نقادوں ہی کی سی ہے بڑے اتنا ہیں کہ دماغ کا معدہ متحمل نہیں ہو پاتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحیثیت نقاد دماغ کا نزلہ جس مضمون پر گرتا ہے اس کے لئے مصیبت بن جاتا ہے اچھا ہوا کہ اینگلو عربک کالج دہلی میں لکچرر ہو گئے ورنہ خدانخواستہ اگر کسی میگزین کے ایڈیٹر ہوتے تو اناڑی شعرا اور آزادی افسانہ نگاروں کا اُٹھنا بیٹھنا دشوار کر دیتے جدید لٹریچر کے حافظ جی ہیں۔ آزاد نظم اور نظم

معریٰ اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی شعر پڑھتا ہے۔ چہرے اور مضامین دونوں سے خاصے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ان کی کوئی آزاد نظم ہائی اسکول کے حساب والے پرچہ کی جگہ لڑکوں میں تقسیم کردی جائے تو طلباء لنگڑی کسر کا سوال سمجھ کر بٹا بس جواب نکال دیں گے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

سرراہے

راہ پر چل رہا ہوں میں اب بھی
پر خیالات وہ نہیں آتے
پھر بھی میں سوچ میں ہوں، سوچ میں غرق
روز کا راستہ ہے یہ میرا
وہ بھکارن جو شب کے وقت یہاں
ہاتھ پھیلا کے
بھیک مانگتی تھی
آج پھر کیوں نظر نہیں آئی۔
— نوجواں تھی مگر تھی کتنی غریب!
خامشی تیرگی سے لپٹی ہے
جس کے سائے میں
یہ عمارت پھر
اک دلہن سی بنی ہوئی ہے آج ———

یہ مگر اس کے کمرے میں
دفعتاً روشنی ہوئی کیوں گل ؟
اور کچھ قہقہوں کے جھرمٹ میں
تھرتھرائی ہوئی سی اک آواز
بن کے ہلکی سی چیخ
ڈوب گئی !

عاشق محمد

میراجی کی شاعری کو پیروڈی کا پہلا سہل آپ ہی نے دیا تھا مگر لاعلاج سمجھ کر ہاتھ روک لیا۔ حالانکہ ان کی شاعری ہنوز بدہضمی کا شکار ہے "شعر کا بران" کے عنوان سے آپ کی پیروڈی کی ایک قاش ملاحظہ ہو۔ جناب عاشق آزاد نظم کے پیٹ میں گدگدی کر کے پڑھنے والوں کے پیٹ میں بھی مارے ہنسی کے بل ڈال دیتے ہیں۔ مزاج میں کافی جان اور زندگی پائی جاتی ہے۔

کاٹ ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوا
چپکے چپکے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہونچا
دم کٹا کھودا انگوڑا پاگل
میں جو نامرد نہ ہوتا تو نپٹتا تجھ سے
کونہ میں دبکا پڑا ہے الو

عبدالمجید بھٹی

باوجود بھٹی ہونے کے آپ کی بعض نظمیں بغیر بھٹی چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آزاد نظموں کے بڑے کارخانہ دار ہیں۔ ہر سائز اور صنع کی نظم لکھتے ہیں جن ریڈیو اسٹیشنوں کو ترقی پسندی کا ہیضہ ہے وہاں سے آپ کو ان کی دو ایک نظمیں ضرور سننا پڑیں گی۔ گیت خاصے اچھے کہتے ہیں۔ ایک نظم جو محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہے ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قینچی نہ ہونے کے سبب دانت سے کاٹ کر ہاتھ سے ایک لمبی چیٹ کسی تھان سے پھاڑ لی گئی ہے اور تانا بانا کمزور ہونے کے سبب وہ چیٹ کہیں ٹیڑھی اور کہیں سیدھی پھٹ گئی ہے۔ جہاں تک آپ کی آزاد نظموں کا تعلق ہے ان کی حیثیت ایک سوالیہ جملہ کے نشان کی سی ہے۔ آپ کے بجائے مصرعے بحر صغیر کا اسقاط معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو جب فرد اور جمعیت کی اہمیت دکھانا ہوتی ہے تو آپ اس کو سوال کی شکل میں حل کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم میں ایک مصرعہ دوسرے مصرعے کے پیچھے اس طرح کھڑا نظر آتا ہے جس طرح راشننگ کی دوکان کے سامنے تیل خریدنے والے ہاتھوں میں بوتلیں لئے دور تک ایک دوسرے کے پیچھے صف بستہ کھڑے کنٹرول کے جنازے کی نماز پڑھانے میں مصروف ہوتے ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

سادہ سوال

ایک ــ ؟

بے کار
حقیر اور بیچارا
تنہا
وجہ پریشانئ خود
ایک اور اک — دو!
جمع کا ایک سادہ سوال
رونق بزم ہستی
ایک ضرب ایک ؟
دو اور اک ؟ — تین ؟
کبھی چار
کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں
اور کبھی اس سے بھی زائد لیکن
پھر جو بٹتے ہیں ؟
تو ہیں چار کے پانچ
اور کبھی تین کے دو !
اور پھر ایک —
وغیرہ وغیرہ

علی جواد زیدی

آپ بیک وقت علی جواد بھی ہیں اور زیدی بھی پھر اس پر طرہ یہ کہ شاعر، مثبت ادیب اور مثبت وکیل گویا۔

سب کو جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ "پہلوان" اُٹھا لایا

کلام میں ایک تفکر، ایک تسلسل اور رومان پایا جاتا ہے۔ ہر مصرعہ میں ایک عزم، ایک استقلال اور ایک جذبہ ہوتا ہے، جوانی کا جوش شعر کے جوڑ جوڑ سے ٹپکا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ میں نظم آزاد اور نظم معری کو اتنی نفرت سے دیکھتے تھے جس نفرت سے ایک کٹ ملا دستر خوان پر ابلی ہوئی دال کو دیکھتا ہے۔ مگر اب اچھے قافیے نہ ملنے پر کبھی کبھی اُن کی طبیعت کو ابالی بھی بہانے لگتی ہے اور چھٹے چھماہے نظم آزاد بھی لکھ لیا کرتے ہیں۔ اگرچہ آزاد نظم پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ہرے ہوئے مقدمہ کو جتانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں مگر اس زور آزمائی میں اپنے رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ الفاظ کی روشنی میں معنویت کی دوشیزائیں ابھرا کرتی نظر آتی ہیں "رگ سنگ" درحقیقت ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے جیل کی واپسی پر آپ نے ترتیب دیا تھا اور اب چھپ کر ادبا کے کتب خانوں کی زینت بنا ہوا ہے اللہ بخشے ان کا پہلا مجموعہ گزشتہ چار یا پانچ سال سے زندہ درگور ہے اور مکتبۂ اردو والوں نے اُسے ایک غیر معینہ مدت تک کے لئے قید کر رکھا ہے اور باوجود مصنف کی پیہم درخواستوں کے اسے پیرول پر بھی رہا نہیں کرتے

اس مجموعہ کی اشاعت کے بارے میں اشتہارات تو کبھی کبھی اخبارات میں ضرور اس اہمیت کے ساتھ شایع ہوتے ہیں کہ جیسے ملک کا کوئی بہت بڑا لیڈر جیل سے رہا ہونیوالا ہے مگر۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے ایک بھاری بھرکم رکن ہونے کے باوجود اُن سے جواد کے تعلقات نند بھاوجوں کے ایسے ہیں یعنی کبھی خاصہ میل جول اور کبھی بے حد ناراضگی۔ ان کی شاعری میں کمیونزم کے "چھواؤ" تو ضرور ہوتے ہیں مگر کیفی اعظمی کی شاعری کی طرح "سجاد ظہیریت" نہیں ہوتی اسی لیے کمیونسٹ شعرا، اُن کو اور ان کی شاعری دونوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے اینگلو رشن ہندوستان کے کسی نیشنلسٹ مسلمان کو دیکھتا ہے۔ ایک زندانی کی موت کا تذکرہ آپ نے اپنی ایک آزاد نظم میں بے حد دلکش انداز میں کیا ہے۔ اچھا ہوا کہ شاعر پیدا ہوئے اور جیل کے پہلے ہی شوب کے بعد آپ کو رفیقۂ حیات کے سپرد کر دیا گیا ورنہ جیل کو رفیقۂ تنہائی سمجھ کر مستقل آمد و رفت شروع کر دیتے۔ آپ کی آزاد نظم لاش ملاحظہ ہو۔

لاش

ہمیں اسے کچل نہ دیں، ابھی یہیں
یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں
نہیں نہیں
بڑھے چلو بڑھے چلو!
کچل بھی دو!

خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش، ہاں اسے مسل کبھی دو
بڑھے چلو، بڑھے چلو۔
ستم کی دھوپ چھاؤں میں۔
مگر یہ کس کی لاش تھی کہ بیڑیاں
پڑی تھیں اب بھی پاؤں میں
یہ کس نے لاش پھینک دی ہے اجنبی سے گاؤں میں
ستم کی دھوپ چھاؤں میں

علی سردار جعفری

اگرچہ بالوں میں کنگھی نہیں کرتے مگر کلام کو نوک پلک سے درست رکھتے ہیں۔ زیادہ تر پابند نظمیں لکھتے ہیں مگر کبھی کبھی نظم معریٰ بھی کہہ لیتے ہیں۔ حال میں آپ کا پہلا مجموعہ پرواز کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ جس میں کچھ نظمیں "پرول یافتہ" ہیں۔ اور جیل سے اڑ اڑ کر آ رہی ہیں۔ ان کے کلام میں جنسی تشنگی کم اور اشتراکیت زیادہ ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ایسے مصرعوں سے بھی پڑھنے والا دوچار ہوتا ہے جن میں بلا کا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ اشعار زیادہ تر سیاسی حالات سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ رسمی اخلاقیات کو مہمل جانتے ہیں اور جہاں تک رومان کا تعلق ہے سپاہیوں کی سی کھڑے گھاٹ محبت کے قائل ہیں۔ مجموعہ میں قصر و محلات کے سخت ترین دشمن نظر آتے ہیں زمانۂ امن میں آپ اور آپ کی شاعری دونوں سامراج کا خون چوس لینے پر اتر آتے ہیں مگر زمانۂ جنگ میں آپ مع اپنی نظموں کے (Peoples War) پیپلیس وار ہو جایا کرتے ہیں۔ آدمی پڑھے لکھے اور بہت سی صلاحیتوں کے مالک ہیں سر دست اپنی تمام ذہانتوں کو کمیونسٹ پارٹی کو راشنی پر دے رکھا ہے۔ آپ کی "سرگوشیوں" کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

اُداس کیوں ہو مری جان؟ کچھ ایسی بات نہیں
کھڑی ہوئی ہیں جو رسم جہاں کی دیوار یں
ہم اپنے ذوقِ نظر سے اُنھیں گرا دینگے

ہمارے بیچ میں حائل وہ آگ ہے کہ جسے
ہماری آنکھ کے آنسو بجھا نہیں سکتے
برہنہ پا ہمیں اس آگ میں گذرنا ہے
اسی میں تپ کے ہمیں ایک دن نکھرنا ہے
نہ جانے تم مری باتیں سمجھتی ہو کہ نہیں

عطاء اللہ سجاد

جس طرح بعض عورتوں کو ایک خاص زمانہ میں کیتھے کی چٹنی اور مٹی کے تھین سکورے کھانے میں مزہ آتا ہے اسی طرح انکی تخیل کو آزاد نظمیں کہنے میں مزہ آتا ہے کلام میں پنجاب کے دریاؤں کی سی طغیانی اور بہاؤ پایا جاتا ہے۔ مصرعے مضبوط ہوتے ہیں مگر مجموعی طور پر کلام کسی ندکوری کی ڈائری سی معلوم ہوتا ہے بعض بعض نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پشتو زبان کی نظم کو کوئی۔ یو۔ پی کا استاد گویا سنا رہا ہے۔ کلام کا سلسلہ نصب ایرانی شاعری سے ملتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :—

وادی کہ دراں خضر را عصا خفت ہست

عشق کی راہ میں آتے ہیں بہت سخت مقام

اور میں ہوں کہ مجھے ہمت پرواز نہیں

ذوق جنگ و تازہ ہیں

چھائی جاتی ہے میری صبح پہ تاریکی شام

میں نے ایک بار محبت کی تھی

لذت اندوز تھا دل غم کی فراوانی سے

زندگی میری عبارت تھی غزلخوانی سے

آہ وہ کیف میں ڈوبے ہوئے دن رات مرے

رفعت عرش پہ رہتے تھے خیالات مرے

عبدالسلام سلام مچھلی شہری

آپ سلام ہیں اور آپ کی شاعری وعلیکم السلام ہے بسر دست آپ کی شاعری پر تفکر کے نہایت دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں لیکن جب بھی شاعری اُردو میں باقاعدہ ترجمہ ہو کر ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گی اُس وقت دنیا ہمارے اِس نوجوان "شاعر، ادیب اور مفکر" کے مرتبے کا صحیح اندازہ لگا سکے گی۔ اِس مردہ پرست دنیا نے آجتک کہاں اور کب اپنے اُدبا، شعراء اور مفکرین کی قدر کی جو سلام کے مرتبہ کی قدر کرتی جہانتک لوگ آپ کی شاعری کو ابتک سمجھ سکے ہیں وہ اِس نتیجہ پر پہونچ پائے ہیں کہ آپ کی نظمیں محض توکل پر زندگی بسر کرتی ہیں اور معنی و مطالب سے بیگانہ ہیں۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا
نہیں گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی وہ نظمیں جو معنی اور مطالب سے یکسر بے بہرہ ہوتی ہیں انہی کو بے حد محنت سے کہتے ہیں اور بہت پسند کرتے ہیں اس لحاظ سے گویا وہ اپنی کسی نظم کا دل میلا نہیں ہونے دیتے۔ آپ کی دوسری "جدید" خوبی یہ ہے کہ آپ اپنے مصرعوں کو گھر سے تنہا نہیں نکلنے دیتے بلکہ ہر مصرعہ کی حفاظت کے لئے دائیں بائیں کاما، فل اسٹاپ، نوٹ آف انٹراگیشن اور چھوٹی بڑی لکیروں کے سنتری ساتھ کر دیتے ہیں اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو آپ کا کلام دوسرے شعراء کے کلام سے دوگنا وزنی ہوتا ہے اور یہ محض حفظِ ماتقدم کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ اگر مشاعروں میں نظم ختم ہونے پر دوسری نظم کی

فرمائش کی جائے تو آپ اُسی نظم کے کاما، فل اسٹاپ وغیرہ پڑھ کر سامعین کی فرمائش پوری
کر دیں اس لحاظ سے بھی آپ دوسرے زود گو شعرا پر ایک حیرت انگیز فوقیت رکھتے
ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی نظموں کا مزاج بے حد "اطمینان بدور" واقع ہوا ہے اگر
شادی نہ ہوئی ہوتی تو چھ سات مجموعے پیدا کر چکے ہوتے مگر عدیم الفرصتی کے سبب صرف
تین مجموعے ابتک بازار میں لا سکے۔ ایک مجموعہ گھر پر بھی ترتیب دیا ہے جس کا ذکر آپ کو
بائبل کے مقدمہ میں ملے گا۔ آپ کی بیشتر نظموں میں ڈرائنگ روم کا ذکر ہوتا ہے حالانکہ
اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو لیٹرن اور باتھ روم اس کے زیادہ مستحق معلوم ہوتے ہیں
کلام میں جہاں جہاں مصرعے اردو بولتے ملتے ہیں وہاں اُن کے منہ سے دیسی سوشلزم
کی بو آتی ہے۔ گفتگو میں نسوانیت کو زیادہ دخل ہے چنانچہ تصویر میں جب ناک پہ انگلی
رکھے نظر آتے ہیں تو بجائے سلام کے تسلیم ہی معلوم پڑتے ہیں۔ آپ کی بے تکلفی کسی تکلف
کی محتاج نہیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں عورتوں، مردوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے یکساں طور پر
گھونٹے لینے کے لئے بے چین رہتی ہیں۔ خواجہ خضر سے زیادہ عمر اور اپنے سے کئی گنا پڑھے
لکھے ادبا سے بھی آپ اسی طرح دھول دھپے سے ملتے ہیں جس طرح آپ کے چھوٹے
آپ سے ملتے ہیں گویا ذہن سے آپ مساوات کے قائل نظر آتے ہیں ذہانت صرف شعر لکھتے وقت
آپ کے قلم سے ٹپکتی ہے ورنہ یوں بات چیت میں ہر وقت آپ سے پردہ کرتی ہے الفاظ
میں جدت اور کہیں کہیں بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ انقلاب کے اتنے بڑے شیدائی
ہیں جتنے غالب آموں کے جلسوں میں اپنی انقلابی نظمیں اس طرح دائیں بائیں دیکھ کر
پڑھتے ہیں جس طرح کوئی حسینہ میلے ٹھیلے میں اپنے عاشق کے منہ میں پان کا بیڑا ٹھونس
دیتی ہے۔ شعر و شاعری میں میراجی کے کلام سے اِس طرح متاثر ہیں جس طرح فدھیا جلی

کوہ ہمالہ سے سیاست سے آپ کو اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ ایک لینڈ سکیپ کو
فنکار سے آپ کا کلام جو زیادہ تر الفکر ہی تفکر ہے اس کا ایک نثری پیراگراف ملاحظہ ہو۔

- بنگال کی رقاصہ

ناچیے ناچیے ـــــ پائل کے بغیر
جسم عریاں ہی رہے
شعلہ افشاں ہی رہے
ناچیے ناچیے ـــــ
بھوک اور موت کا رقص
میرے بنگال کا رقص
ناچیے سوچتی کیا ہیں ـــــ اٹھیے!
آپ بنگال سے کب آئی ہیں
نغمہ و رقص کا پیکر بن کر
جسم کو بیچیے ـــــ پتھر بن کر
ناچیے - ناچیے ـــــ
میں پاگل ہوں ـــــ
یونہی بکا کرتا ہوں ـــــ!

علی احمد

بیشتر پابند نظمیں لکھتے ہیں۔ مگر جب بہت زیادہ "خوش مزگیوں" میں آتے ہیں تو تخیل کے کان میں بیٹھ کر نظم معریٰ بھی کہلوا لیتے ہیں۔ کلام میں جنسی لہروں کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ بہت سے مصرعے "اجنبی دلکشیوں" کے حامل ہیں۔ تخیل میں اتار چڑھاؤ اور خون کے دباؤ کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ آزاد نظم لکھتے وقت مصرعوں کے تنگے کھلے کا خیال نہیں رکھتے۔ کلام میں طوفان کی سی ہیجانی کیفیت پائی جاتی ہے۔

زیر شبنم نرم روئیں دار پنکھڑیاں گلاب تر سرخ کی
آ — قریب آ — تا کہ میرے دل کی پیاسی دھڑکنیں
جذب ہو جائیں برس کر
تجھ میں، تیری نبض میں، تیرے شباب تند میں

غلام ربّانی تاباں

خاصی پابند نظمیں کہتے کہتے آزاد نظموں کا شکار ہو گئے تخیل کی کٹیا میں الفاظ کا
نفوڑا سا چارا لگا کر جب بحرِ سخن کے کنارے ادبی مچھلی پکڑنے بیٹھتے ہیں تو سوائے
بام مچھلی کے کوئی دوسری مچھلی ہاتھ نہیں لگتی نتیجہ یہ کہ کمر دہ سمجھ کر لوگ اسے بہت کم
استعمال کرتے ہیں۔ رسالوں میں کبھی کبھی اِن کا اس قسم کا مارا ہوا شکار جب نظر
آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اِن کا جیسا ادبی کھلاڑی یہ کیسے کیڑے مکوڑے
پیش کر رہا ہے۔ کلام خواہ وہ آزاد نظم ہو یا پابند دونوں میں ایک خیال ہوتا ہے جو
پوری نظم پہ چھپا یا نظر آتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

فتح پور سیکری

اکبر آباد کے اطراف میں آثارِ قدیم
آج بھی ملتے ہیں اسلاف کی عظمت کے نشاں
جودھا بائی کا محل۔ مغلوں کی قومی تحریک
اس سے حاصل یہ کہانی نہ یہاں ہے نہ وہاں
انہی کھنڈروں میں تو رہتا تھا "خدا کا سایہ"
سُرخ پتھر پہ جھلکتا ہے غریبوں کا لہو
دعوتِ مرگ تھا تیموری سیاست کا تضاد
اک طرف خونِ جگر ایک طرف جام و سبو

فکر تونسوی

جس طرح ایک نئی نویلی دلہن اپنے شوہر کے جو بیس گھنٹے سوالیہ نشان بنے رہنے سے گھبرا جاتی ہے اسی طرح بیچاری آزاد نظم آپ کی زود گوئی سے سخت عاجز ہے کیونکہ آپ اُس کو ہر پہلو سے نظم فرما کر اپنے تجربوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ بعض نظموں میں چھوٹے مصرعے بڑے مصرعوں کے مولوی صاحب کو اپنا آموختہ سناتے نظر آتے ہیں بعض میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی پرائمری اسکول کا ٹیچر لڑکوں سے تعلیمیں کر رہا ہے۔ پورے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کی شاعری نے جس دایا کا دودھ پیا ہے اُس کی سوتیلی بہن نے آپ کی شاعری کو گود لے رکھا ہے معنوی اعتبار سے احمد ندیم کی شاعری عمر میں بڑی لگتی ہے۔ ادب لطیف کے ہر نمبر میں صفحات کے کسی نہ کسی گوشے میں انکی ایک آدھ نظم بیٹھی آپ کو اشاروں اشاروں میں اپنی طرف مخاطب کرتی ملے گی۔ کلام میں اکثر اشعار کراہ کراہ کر ایک دوسرے سے اس طرح درد دل بیان کرتے ملتے ہیں جیسے کوئی عورت کسی لیڈی ڈاکٹر کو اپنے نسوانی امراض بتاتی ہو۔ جو خیال جہاں بھی آوارہ گردی کرتا ملتا ہے آپ اُس کو پکڑ کر اپنے ریفارمیٹری اسکول (آزاد نظم) میں بھرتی کر دیتے ہیں چنانچہ معصوم اور شگفتہ خیالات اب آپ سے اس طرح ڈرنے لگے ہیں جس طرح معصوم بچے ٹیکہ لگانے والوں سے۔ بعض نظموں میں جہاں جہاں ابہام پرستی کو دخل نہیں ہوتا خاصی اچھی ہوتی ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اپنی فولاد میں ڈھالی ہوئی باہوں سے نہ جا
کیا یہ تو ہے مرے ترشے ہوئے ماضی کا گھمنڈ
لو جھکا کر تو نے جسے اُس کے لب لعلیں سے
اپنی اُن گرسنہ شریانوں میں تحلیل کیا

فیض احمد فیض

بڑے خوش فکر شاعر ہیں مجبر اور لفٹننٹ کے خطابات ان کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ بے ادبی کا درجہ رکھتے ہیں شاعری کا مسلک اشتراکی ہے اور کلام نے کسی شوخ حسینہ کی چشم غزالاں سے بہت سے حسین اشارے چرا کر رکھ لئے ہیں۔ دل سے رومانی اور آنکھوں سے نفسیاتی معلوم ہوتے ہیں احساس کی شدت جگہ جگہ لطیف انگڑائیاں لیتی چلتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کا ذکر اس طرح مسکرا مسکرا کر کرتے ہیں جیسے کوئی نئی بیاہی دلہن شوہر کی زیادتیوں کا شکوہ بڑی بہن سے کرتی ہے ... مجبر اور وزن دونوں کے قائل ہیں۔ بعض بعض نظموں میں قافیے، پابند نظموں سے ناخوش ہو کر ہڑتال کئے نظر آتے ہیں مگر نظموں کے چہروں پر وہی شادابی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو کلرکوں کے چہروں پر تنخواہ والے دن نظر آتی ہے۔ پورا کلام "نوعمر الفاظ" اور "دوشیزہ بندشوں" کے پھولوں میں گندھا ہوا ہار معلوم ہوتا ہے۔ عقائد میں پختگی اور "بوڑھا پن" پایا جاتا ہے۔ امید کا دامن کٹ کٹا کر دانت سے پکڑے رہتے ہیں۔ جب آزاد نظم لکھتے ہیں تو اس کے بول بعض اوقات کبوتر کی غٹر غوں کا سا ترنم پیدا کر دیتے ہیں۔ پابند شعر بڑے سلیقہ سے کہتے ہیں ان کی وہ نظمیں جن میں ابہام ہوتا ہے اس کے سمجھنے والے دہلی اور لاہور کے اسٹیشنوں پر سستے داموں دستیاب ہو سکتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری، کہسار سے یلغار کرے!
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں، کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں!
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں،
اور مشرق کی کمین گاہ میں دھڑکتا ہوا دل
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے!

فضل حسین کیف

بہت سوچ بچار کے بعد "نوعمر" مصرعے یکہ گراں پر طویل القامت مصرعے لاد دیتے ہیں جیسے کہ ایک دبلے پتلے یکتا والے کی رکشا پر دو عدد سواریاں سوار ہو جائیں نظم میں تخیل الفاظ کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر اس طرح قافیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ملتی ہے جیسے کوئی نوعمر طوائف راہ گیروں پر عشق کا افسوں چلاتی ہو۔ ذیل کی نظم کا عنوان ہے "تھرسے رنگ اگھری لہر" معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ادبی دوپٹیا لہریا رنگ کر الگنی پر ٹانگ دی گئی ہے کلام میں "ضیاء الاسلامیت" پائی جاتی ہے اشعار کی شادابی کا سکہ جمانے کے لئے چھوٹے مصرعوں میں جو اکھوے پھوٹ نکلے ہیں ان کو ڈیشوں کے ذریعہ سے واضح کر دیا گیا ہے ان کی چھوٹی نظموں میں اگرچہ رس بالکل نہیں ہوتا مگر باشا واللہ گٹھلی خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے جگہ جگہ محاکات کی گرمی لفظی جمود کو پگھلاتی نظر آتی ہے گو کلام بے سُرا نہیں ہے تاہم اس میں وہ کیف نظر نہیں آتا جو کہنے والے کے نام میں ہے۔

اسی اک سوچ میں رہ جاتے تھے دن رات تمام
چشم پرآب لئے ________
دل بیتاب لئے ________
عشق کی ساز کی مضراب لئے ________
میرے غم خانہ میں بکھراتے ہوئے دوش پہ بال
آئے گی بھی کہ نہیں آئے گی۔

فراق گورکھپوری

ترقی پسندوں میں اور ان میں صرف اس بات پر کھٹ پٹ ہے کہ وہ شاعری میں معشوق مونث باندھتے ہیں اور سہ بے چارے غزل یا مونث مذکر کے قائل ہیں۔ پابند نظم لکھتے لکھتے ادھر کچھ دنوں سے معریٰ نظموں پر بھی طبع آزمائی شروع کر دی ہے جب سے ان کی پابند نظموں کو روگ لگ جانے کا خطرہ محسوس کیا جانے لگا ہے۔ بہت پڑھے لکھے ادیب، شاعر اور نقاد ہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بہت سے اردو شعرا جن کا پورا کلام ان کی نظر سے نہیں گذرا ان کے بارے میں بھی بعض اوقات کسی خاص کیف میں آکر ایسی نرالی بات لکھ مارتے ہیں کہ ادبا اور نقاد چونک پڑتے ہیں۔ مثلاً آپ کا خیال ہے کہ حکیم مومن خاں مومن نے کوئی مثنوی ہی نہیں لکھی۔ کلام میں محبت اور فلسفہ ماں بیٹیوں کی طرح خانہ داری کا انتظام کرتا ملتا ہے۔ آپ کا کلام خود آپ کی زبان سے سنتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڈھا کسی جوہری کی دوکان کے آگے پہرہ دے رہا ہے۔ مشاعروں میں اپنی آواز سے کھیل گھر کا سا منظر پیش کر دیتے ہیں اور مصرعوں کے حسین ترنم کو بری طرح ذبح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عجب نہیں جو جدید شاعری . . . .

سے متاثر ہو کر بڑھاپے میں دو چار زینے اور نیچے اتر کر ایسی شاعری شروع کر دیں کہ دنیا حیران ہو کر رہ جائے۔ ذیل کی نظم کا اقتباس ان کی آئندہ شاعری کا دہشت انگیز نمونہ ہے۔ اس کا ہر ہر مصرعہ ان کی پابند نظموں سے نمک حرامی پر کمربستہ نظر آتا ہے۔

ان کی ایک ناخلف نظم کا ٹکڑا ملاحظہ ہو :—

آدھی رات کو

اب آپ اپنی ہی پرچھائیں ہیں گھنے اشجار
فلک پہ تاروں کو پہلی جمائیاں آئیں
تنبولیوں کی دوکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پہ
سواریوں کے بڑے گھنگروؤں کی جھنکاریں
کھڑے ہیں سمٹے ہوئے ایسے ہرسنگار کے پیڑ
جوانی جیسے حیا کی شگفتہ سے بوجھل
سپاہ روس ہے اب کتنی دور برلن سے ؟

قتیل شفائی

آپ کی آزاد نظموں میں ایک مصرعہ اگر اکائی ہے تو دوسرا دہائی۔ گو کلام میں شفا نہیں پھر بھی شفائی ہیں۔ ہر مصرعہ ان کی ادبی مسیحائی کا شاکی اور ایک دوسرے سے لگائی بجھائی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ بعض نظموں میں الفاظ نے معنویت کی اور معنویت نے الفاظ کی صفائی کر دی ہے۔ فلم کے لئے آپ سب سے زیادہ موزوں تھے۔ اگر کلام کو کسی فلمی یتیم خانہ میں داخل کر کے اپنے جملہ فرائض سے سبکدوش ہو جاتے تو اچھے رہتے۔ نظموں میں "شوکتی" الفاظ اور جدید تشبیہات اور بین الاقوامی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی ایک پابند نظم کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

کوہسار ہن کی آغوشِ گل پوش میں نقرئی بادلوں نے بسیرا کیا
رات بھر بوندیاں رقص کرتی رہیں بھیگی بوٹیوں نے سویرا کیا
سو گئیں صاف شفاف پگڈنڈیاں میلی میلی پہاڑوں کے منہ دھل گئے
سوئی سوئی فضا آنکھ ملنے لگی سیلی سیلی ہواؤں کے پر کھل گئے
وجد میں آگئیں شوکتی جھاڑیاں مست جھرنے نئے گیت گانے لگے
اونچے اونچے صنوبر کھلتے ہوئے مل کے جشنِ مسرت منانے لگے

قیصر

آپ کی شاعری شاد عارفی کی پابند شاعری کی مختلف البطن بہن ہے اور راجہ مہدی علی خاں کی شاعری سے اسکا ننھیالی رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ طنز نگاری کے شوقین ہیں مگر طنز میں پھیکے پنے کے ساتھ ساتھ کھرا پن پایا جاتا ہے۔ آپکے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو غزل اور ہزل دونوں طرح مشاعروں میں پڑھا جا سکتا ہے اور یہ سامعین کی سخن فہمی کی ایک بہترین کسوٹی بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کے پابند اشعار میں میراجی کی نثر کا سا لطف آتا ہے۔

ایک صاحب کا وہ بل ڈاگ جو کل دیکھا تھا
کار میں لوز کی آغوش میسر تھی جسے
دودھ اور شہد پیا کرتا ہے ہر صبح و مسا
رزق کی فکر سے آزاد ہیں اس کے لمحات
اس تعیش میں کوئی وعدہ فردا بھی نہیں

قیوم نظر

پنجاب کے ترقی پسند نوجوان اور "اُٹھتے ہوئے" شاعر قیوم نظر کی شاعری ہمارے ادب میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک غیر کفو لڑکی کسی اونچے گھرانے میں۔ نظموں کی سج دھج ایک بد دِکھوا شوہر کے مانند ہوتی ہے جو کسی دوشیزہ کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لئے گھر سے بہت "ٹھنا ٹھنا" کر نکلتا ہے۔ ابہام اکثر نظموں میں مصرعوں کا گلا گھونٹتا اور معنویت پر آنکھیں نکالتا دکھائی پڑتا ہے۔ بہت سی نظمیں جو اقبال اور یگانہ کے سنگم پر لکھی گئی ہیں ان کی تاریخ جن کو جدید ادب کے سن و سال کا پتہ چلتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے کلام میں ایک قسم کا ٹھہراؤ ضرور ہے مگر الفاظ کے چھچھلے پن نے ایک سوئے ہوئے آدمی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی بہت سی نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب کی گاڑی میں جوتنے کے لئے آزاد نظم کی گھوڑی کو نکالا جا رہا ہے۔ نظم کے اکثر مصرعے اس ٹریننگ میں دولتیاں اچھالتے چلتے ہیں۔ مگر ان کی روک تھام کے لئے بندشوں کی چابک اوپر سے زور شور سے استعمال ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کی شام والی آزاد نظم اس تجرباتی دور سے نکل کر اب ادبی بگھی میں جوتنے کے قابل ہو گئی ہے بقیہ نظموں میں ابھی ایک سہانہ باقی ہے۔ بحالت موجودہ کلام میں رنگ برنگی قندیل کی دھندلی روشنی پائی جاتی ہے۔

انبوہ کثیر

ہر طرف پھیلتا ، بڑھتا ، چڑھتا
اب کہاں وقت "دل و دست" کی غمخواری کا
خون آلودہ افق کی زنجیر
پیچ و خم کھاتا پراسرار دھواں
اور اک ڈوبتی آوازِ گراں
ہے نشانِ جانکنیِ عشق کی دشواری کا
رات کی سرمگیں زلفوں کا اسیر

کاوش انصاری

فیض آباد میں آزاد نظم لکھنے والوں میں آپ کی حیثیت محض واحد حاضر کی ہے گویا آپ اپنے شہر کے قطب ہیں نظم آزاد اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ ایک عدد ترقی پسند رسالہ کے مدیر اور ایک عدد ترقی پسند نظموں کے مجموعہ کے مرتب ہیں گھر والے دو نظمیں لکھ کر آپ اپنے ہی رسالہ میں چھاپ لیتے ہیں گفتگو میں زبان ہر ہر فقرے کی کان گوشی کرتی چلتی ہے۔ ترقی پسند آپ کو کم جانتے ہیں مگر آپ بلا دیکھے بھی بچوں کو پہچانتے ہیں۔ کلام میں آن زیادہ اور جان کم ہوتی ہے پابند نظمیں بھی کہتے ہیں اگر اُن کو معصوم بچوں کی طرح گھر سے نہیں نکلنے دیتے اور عروض کے ہوّے سے ڈراتے ہیں۔ پڑھنے میں ہکلاہٹ کی میٹھی میٹھی چاشنی ہوتی ہے جس سے اُن کی آزاد نظم کے چھوٹے مصرعے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے مصرعوں کی اُنگلی پکڑے اس طرح دوڑتے ہیں جیسے واقعی برابر کے ہیں۔ جن اشعار میں ابہام ہوتا ہے اُن کو سمجھنے کے لئے کسی پنڈت کو اِن کی نظم کا ہاتھ دکھانے کی ضرورت درکار ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

جلترنگ

"انگلیاں جلنے لگیں اور پگھلنے لگا آنکھوں کا خمار

سرسراہٹ سی ہوئی
کانپ اٹھی رگِ انجاں میں کوئی انجان شکستہ سی پکار
نرم آواز اٹھی
اور پھر تیز ——— بہت تیز !! رواں اور دواں
کتنی چمکیلی سنہری آواز
اک نئے باب کا جیسے آغاز

کرشن

آپ کی آزاد نظموں میں ایک قسم کی جھنکار پائی جاتی ہے۔ رسائل میں عام ترقی پسندوں کی طرح آپ کی نظم عورت کے قریب ہی بستر بچھائے ملتی ہے۔ بعض مصرعوں میں ایک قسم کی مریدانہ شان پائی جاتی ہے۔ ایک چیز کی کمی نے ان کی شاعری کو ترقی پسندوں کی غلام گردش بننے سے بچا لیا یعنی مطالب کی براہ راست ناک پکڑتے ہیں جس سے ان کا کلام قابل فہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصرعوں میں الفاظ کی خانہ پری بہت سے ڈیشوں سے کبھی کر دیا کرتے ہیں مگر اشعار ڈور کے ڈول کی طرح بہت سہانے ہوتے ہیں۔

طلسم نو

دور سے مجھ کو صدائیں آئیں۔
سانپ لہرانے لگے
اجنبی سائے مری آنکھوں میں بل کھانے لگے
مجھ کو ماحول تھا پتھر کی لکیر
(رخِ رنگین ..... لبِ احمر .... گیسو
راحتِ دیدۂ دل)
میرے محبوب مری آنکھوں میں کاجل کے خطوط
میری رنگیں تمناؤں کی خالق .... پلکیں
ان لکیروں کا فقیر
دلِ ناداں تھا ابھی

میراجی

روز ازل جب ذہانتوں کے حصے بٹنے لگے تو آپ کسی ترکیب سے چوہرا حصہ لیکر مجلس سے نکل بھاگے۔ چنانچہ نہایت عمدہ نباز اور بڑے "الاز" قسم کے شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری دست خود دہان خود کی قائل ہے۔ جنسی معاملات میں کسی کے دست نگر اور محتاج نہیں۔ رفیع احمد خاں مرحوم کے الفاظ میں ان کی "خودداری" پر رشک آتا ہے کیونکہ وہ کبھی کسی غیر کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ گھر بیٹھے کیا چلتے پھرتے وہ کیف حاصل کر لیتے ہیں جو بیچارے فرہاد مرحوم کو مرتے مرتے نصیب نہ ہو سکا۔ ان معنوں میں آپ "ترقی پسندوں" سے بھی کئی کوس آگے نظر آتے ہیں۔ آپ کی آزاد نظم کے مصرعے دنیا کے ہفت عجائبات میں آٹھویں کا اضافہ کرتے چلتے ہیں۔ آپ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے لاہور ریڈیو اسٹیشن تک کا ایک مصرعہ لکھ کر جب اس پر دوسری ننھی سی گرہ لگا دیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ہاتھی کو پکڑ کر کسی بھیجے کا کاوب باندھ دیا گیا ہے یا قطب مینار کے مقابلہ میں اشوک کی لاٹ کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ہر مصرعہ معنویت کا انڈر ویر پہنے ملتا ہے۔ لوگ پھول یا کسی دوشیزہ کے حسن سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں مگر آپ کی افتاد طبع کچھ اس ڈھنگ کی واقع ہوئی ہے کہ آپ اچھی خاصی جوان عورت کے پیشاب سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اپنی پوری پوری نظم اس دبی دبی دھار سے شرابور کر دیتے ہیں۔ کلام میں ٹوٹ کے ایسے بڑے بڑے مصرعے بھی ملتے ہیں جن کو آپ توڑ مروڑ کر ایک پڑیا میں باندھ سکتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کا اگر کوئی طویل القامت مصرعہ

کسی مشاعرہ میں بطور طرح کے دیدیا جائے تو اس کو چھوٹی بحر کی ایک طویل نظم میں بہ آسانی منتقل کیا جاسکتا ہے۔ انگریزی اردو اور ہندی تینوں زبانوں کا لٹریچر اس قدر پڑھ رکھا ہے کہ دماغ کو رن ٹائمن لیو" لیکر بھاگ نکلا ہے بشرطیکہ ہوش باتوں میں بے حد دلکشی اور جاذبیت ہوتی ہے "شعر گوشاز" اور "نثر گو" شاعر ہیں ہاتھ میں لوہے کے دو سنڈیلوی وضع کے لڈو لے کر نکلتے ہیں اور جب کوئی "عورت گیر" نظم لکھتے یا سنتے ہیں تو کسی مخصوص کیف سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان کو دبانا شروع کر دیتے ہیں۔ گلے میں ایک عدد بالا طرح پڑا رہتا ہے جس طرح بچوں کے گلے میں ازاربند تاکہ ذہانتوں کا ہینیٹ ٹانگوں پر نہ اتر آئے۔

نظموں کے عنوانات بھی الوکھے ہوتے ہیں۔ حرامی۔ سرسراہٹ۔ لب جو بائے وغیرہ۔ ان کی لاشعور سے نکلی ہوئی نظموں میں آپ کو اپنی "اونچا مکان" والی نظم بے حد پسند ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:—

میں یہ سمجھا تھا ترے جسم گرانبار میں بستر ہے چھپا
اور اک نازنی لیٹی ہے وہاں تنہائی
ایک ہلکی سی تھکن بن کے گھسی جاتی ہے
ذہن میں اس کے مگر وہ بیتاب
منتظر اسکی ہے پردہ لرزے
پیر میں ایک ڈھلکتا ہوا بادل بن جائے
اور در آئے اک آندھی کی انوکھی صورت
کچھ غرض اس کو نہیں ہے اس سے

دل کو بھاتی ہے نہیں بھاتی ہے
آنے والے کی ادا
اُس کا ہے ایک ہی مقصود وہ استادہ ہے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقش عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے

اور وہ بن ترا مد مقابل ہیں
ذہن انسان کا طوفان کھڑا ہو جائے

اور وہ نازنیں ———
ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے

تمکین احسن کلیم

تمکین احسن درحقیقت قدرت کی طرف سے "تحسین" احسن بنا کر بھیجے گئے تھے مگر والدین کی ستم ظریفیوں نے تمکین احسن کر دیا۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بہرحال سر دست آپ تمکین احسن ہیں۔ کلیم تخلص کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں غالباً خودداری سے کام لیا گیا ہے کیونکہ یہ تخلص ان کے حسب حال ہے۔ صورت پر ایک قسم کی معصومیت برستی ہے رنگ، روشن غالباً محبت کی تلخیوں نے کملا دیا ہے اور ادبی اور کی ضربیں مارتے مارتے آواز اس قدر مدہم اور تھوڑی سی مقدار میں رہ گئی ہے کہ اسے آپ قومی امانت سمجھ کر بہت کفایت سے صرف کرتے ہیں۔ چوتھی کے دولہا کی طرح کم سخن، سنجیدہ اور شرمیلے انسان ہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنی ہنسی سے جھینپتے ہیں۔ قومی آواز کے ادارہ تحریر میں ایک ممتاز رکن ہیں اور ساتت قد آدم کالموں کا بار گراں اس طرح اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہیں گویا گائے اپنے سینگوں پہ دنیا لئے کھڑی ہے۔ قومی آواز کو رفیقۂ حیات سمجھ کر اسی کے بناؤ سنگار میں لگے رہتے ہیں۔ شادی اس لئے کرتے کہ اول نکاح پڑھوانے کی فرصت نہیں دوسرے رات کے حسین لمحات قومی آواز سے منسوب ہیں۔ شہر میں مکانوں کی قلت کے سبب، باوجود تمکین ہونے کے لامکاں ہیں اپنی ذہانتوں اور صلاحیتوں کے پائنچے کھونس کر جب گھر سے بتاتے ہوئے نکلتے ہیں تو قدموں کی چاپ

"باادب، باملاحظہ، ہوشیار" کی آوازیں نکلتی رہیں۔ فیض کے کلام سے بے حد متاثر رہیں اور اس کی جھلک جگہ جگہ ان کے کلام سے کبھی کبھی پھوٹی نکلتی ہے اگر فیض کا دوسرا قافیہ بری طرح سے شروع ہو کر عش، پہ نہ ختم ہوتا تو ممکن تھا کہ مارے عقیدت کے اسی کو اپنا تخلص قرار دے لیتے۔ کلام میں کھنچی ہوئی یاسیت اور سی جوش کی ہوئی پختگی پائی جاتی ہے اور ان سب پہ روشن پہ شہوں کے صیقل نے کلام کو خاص مرادآبادی برتن بنا دیا ہے اکثر نظمیں تندرست اور خود ان کے وزن سے دوگنی وزنی ہوتی ہیں۔ تقریباً تمام نظموں میں معنویت کی ایک آخری کا سرعود میں پھوٹتی ہے جس کی روشنی میں نظم اپنی کامیابی پر دو رکعت نماز شکرانہ پڑھتی نظر آتی ہے ایک ایک نظم سوا سوا ڈیڑھ ڈیڑھ سال میں تیار ہو پاتی ہے چنانچہ ہتھنی اور گھوڑیاں اُن کی ولادت پر رشک کرتی ہیں۔ شعر اس قدر زور دے کے اور پڑھ کر سناتے ہیں جیسے کوئی دلہن دائی کے سامنے پہلی مرتبہ اپنا پیٹ کھولتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:—

لٹ گیا جاگتی ہنستی ہوئی راتوں کا سہاگ
اپنی ہی مانگ ثریا سے سنواری نہ گئی
چھیڑ پر ٹوٹتے تارے کے لرز اٹھتا ہے
ایک سویا ہوا سا نور سا راگ
حسرتِ خفتہ میں اک لہر سی یوں اٹھتی ہے
لغزشِ پا کا کوئی جیسے سہارا چاہے
رگِ احساس میں ہیجان کے انداز نہ پوچھ
زندگی جیسے قدم کوئی اٹھانا چاہے—

موہن سنگھ دیوانہ

بہت پڑھے لکھے دیسی اور بدیسی ڈگریوں سے ملبس قسم کے ترقی پسند شاعر ہیں جب
ادب برائے ادب لکھتے ہیں تو بہت خوب لکھتے ہیں جب ادب برائے زندگی پر اتر
آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے رنگ سے ٹھٹھول کر رہے ہیں اتنے زود نویس
اور زود گو ہیں کہ جو لکھ دیتے ہیں اس پر نظر ثانی کئے بغیر شایع کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے
دوبارہ پڑھنے اور اس کو اُردو رواں کرنے میں ہفت خوان . . . . . سے زیادہ دشوار گذار
راہوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے ایسے ایسے بے ڈھب شعر کہتے ہیں کہ ترقی پسند بھی ششدر
ہوکر رہ جاتے ہیں۔ آٹے کی مشین میں اگر کوئی چیز لپیٹ میں آجاتی ہے تو پس کر رہ جاتی ہے
یہی حالت اُن کی آزاد شاعری کی ہے جو چیز اُس لپیٹ میں آجاتی ہے کسی نہ کسی عنوان
نظم ہوکر رہ جاتی ہے، اُن کی اس قسم کی شاعری کی رفتار ریس کے منہ زور گھوڑے سے
زیادہ زور دار معلوم ہوتی ہے عجیب و غریب بین الاقوامی قسم کی شاعری کرتے ہیں۔ بھانت
بھانت کے خیالات نظم ہوتے ہیں جب ان کی آزاد شاعری کا اسپیشل چھوٹتا ہے تو سجور
کی تمام پٹریوں کو پہلے سے صاف کر دیا جاتا ہے تاکہ راستہ میں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے کیونکہ
آپ جس وقت چاہتے ہیں اُس کی پٹری بدل دیتے ہیں۔ اُردو، ہندی، سنسکرت،
گجراتی غرض چوبائی شاعری کرتے ہیں اور ہر قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی خیالات اُن کی زد
میں رہتے ہیں۔ بہت سے ثقیل الفاظ جن کو اپنے مستقل پر ایک زمانہ سے ناز تھا وہ بھی اُن کی
شاعری کے سامنے ہتھیار ڈالتے نظر آتے ہیں۔ بیشتر الفاظ نظم ہونا نہیں چاہتے مگر اُن کی

شاعری کا خوف اُن پر اس درجہ غالب ہوتا ہے کہ سوائے نظم ہو جانے کے کوئی راہِ فرار ان کو نظر نہیں آتی۔ انگریزی کے بھی بہترین انشاپرداز ہیں۔ زبان پر کافی قدرت ہے۔ یہ اور ان کی شاعری غائبانہ اور بالمشافہ بہت خلوص سے ملتے ہیں۔ ان کی آزاد نظموں میں ایک قسم کی "نصب العینیت" پائی جاتی ہے۔ گاندھی جی کے بُت سے لیکر ان کی گرام سدھار کی اسکیم تک سے متاثر نظر آتی ہیں بعض اوقات بیک وقت کئی چیزوں سے متاثر ہو کر شعر کہدیا کرتے ہیں آن کے ایسے اشعار کے تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نئی دنیا سے دو ٹکڑے آپ کے تفننِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ کہیئے کیسا کہتے ہیں۔

صرف نحو

اللہ اسم
ہم ہیں فعل
اللہ حروفِ جار
ہم ہیں اسمار
ہم ہیں خبر
مبتدا ہے اللہ
وہ ہی کچھ سمجھا جو سمجھا یہ

کہ اسم ذات ہے اور ذات اسم
اُسی نے کچھ جانا جس نے جانا

کہ اسما صفات ہیں اور ذات ہے بے نام و بے نشاں
سب افعال اسی کے ہیں اے خود کو فاعل سمجھنے والے

نہ تو فاعل نہ تیرا دشمن نہ دوست تیرا
کل کائنات فقرہ ہے ایک سبحان الذی
کل کائنات نظم ہے ایک اللہ ہو۔ اللہ ہو
وغیرہ وغیرہ

ملّا لکھنوی

یو۔پی کے "نیم نوجوان"، خوش فکر، خوش فہم اور خوش گو شاعر اور ادیب جناب پنڈت آنند نرائن ملّا ایک متوسط قامت کے دکیل نما انسان ہیں آپ کبھی کبھی اپنے دل کا نجار، نظم معریٰ کہکر بھی نکال لیا کرتے ہیں مگر طبیعت کا زور، الفاظ کی دل آویزی، اسلوب کی دلکشی اور محبت کی حلاوت اُس میں بھی اپنے پورے شباب پہ نظر آتی ہے۔ اشعار میں ناکام محبت کے عناصر اور دل ہلا دینے والی یاسیت اتنی زائد ہوتی ہے جو ایک شادی شدہ بیوی بچوں والے شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ قطعاً گھر والی سے چھپا کر شعر لکھتے ہوں گے کیونکہ ان کی شاعری میں سوتاپے کی خاصی بو آتی ہے۔ کلام میں ان کا ناکتخدا محبوب ان کے دکھے ہوئے دل کی عیادت کرتا جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اشعار سنتے وقت سامعین ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جیسے محرم اور بقرعید کے دونوں مہینے ایک ساتھ سر پہ آگئے۔ اگر کسی مشاعرہ میں فراق اپنی آزاد نظم تحت اللفظ پڑھتے ہوں اور جناب ملّا اپنے بہترین اشعار ترنم کے ساتھ سناتے نظر آئیں تو سامعین کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ دونوں میں بڑا ابکرا کون صاحب ذبح کر رہے ہیں کیونکہ دونوں اپنے اپنے کلام کے بہترین جلاد ہیں۔ آپ جس وقت اپنا کلام کسی مشاعرہ میں پڑھتے ہیں تو سامعین کا دل چاہتا ہے کہ آن کی نظم اُن سے چھین کر ان کا کلام اہل مشاعرہ کو سنا دیں اور جس قدر داد ان کو مشاعرہ میں مل رہی ہو اُس کو یک جا کرکے ختم مشاعرہ پہ ان کے حوالہ کر دیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

صبح آزادی!

شب مردہ کی لیے لاش حسین شانوں پر
گنگنا جس کا ابھی تک ہے بدن
رقص کرتا ہوا آتا ہے نیا طفلک صبح
صبح آزادی زندان وطن
لڑکھڑاتے ہوئے اس بار گراں کے نیچے
بہکے بہکے ابھی پڑتے ہیں قدم
پھر بھی اک خلد نظر جنت کیف
مستیٔ رقص سے ہر عضو حسیں نشہ میں چور
تن پہ زرتار سہ رنگی پوشاک

زعفران، سبز و سفید
جو سکتی ہے ہر اک خلش یاس سے کچھ اور
نگہ گرم تمنا کے لئے اک مہمیز

احسن علی خاں

ان کی آزاد نظموں میں ایک جوش ایک ولولہ، ایک ترنم، ایک ہم آہنگی اور وطن پرستی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہ اور ان کا کلام دونوں اگر بغاوت کی صورت میں پکڑ جائیں تو سی کلاس کی قید بآسانی برداشت کر سکتے ہیں۔ نظم کے ہر مصرعہ کے کان ایٹھ کر اس میں اس قدر کوک بھر دیتے ہیں کہ جب مصرعوں کا نظم میں منتقل ہونے کے بعد الارم بجتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کیپٹن شاہ نواز اپنی فوج کو پریڈ کراتے ہوئے کوہ ہمالیہ کی وادیوں کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ آزاد ہندوستان کے آزاد اور انقلابی شاعر بننے کی صلاحیتیں آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ الفاظ وزنی اور بھاری بھرکم استعمال کرتے ہیں۔ ہر مصرع کے پشت پر مولانا عطا اللہ شاہ تقریر کرتے معلوم پڑتے ہیں۔ آپ کی آزاد نظم جو آپ نے کشمیر میں سامراجی قتل و غارت گری سے متاثر ہو کر لکھی ہے اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں ملاحظہ ہو۔

برس رہی ہیں؛
وہ ہو رہی ہے فائرنگ
تڑپ رہے ہیں خاک پر مرے وطن کے نوجواں
وہ جن کی زندگی تھی ایسی زندگی
کہ جس سے تنگ آ کے وہ
چلے گئے ہیں موت کی پناہ میں

کہاں ہو ادائے مسیح
نگاہ تو کرو ذرا
وہ بے گناہ مر رہے ہیں جن سے تم کو پیار تھا
وہ مر رہے ہیں زندگی کے واسطے
وہ زندگی جو سامراج کے لئے ہے موت
وہ زندگی جو تخت و تاج کے لئے ہے موت
انھیں تو مرنے دو کہ یہ اجل ہی زندگی کی ہے ابتدا
انھیں ہو کیا خبر کہ موت کیا ہے؟ جو کبھی جئے نہیں
جو مر رہے ہیں اُن کے واسطے اجل ہے ایک انقلاب
وہ انقلاب جو ہے صبح زندگی کا آفتاب۔

مسعود پرویز

سیتارام قسم کا مرد نما عورت اور عورت نما مرد جیسا نام ہے ۔ نام میں کلام سے زیادہ زور اور رومان پایا جاتا ہے ترقی پسندی کی آگ میں ان کا کلام اوٹایا تو گیا ہے مگر اچھا ابلا نہیں گیا جس کی وجہ سے وہ رنگ نہیں آ پایا جو ان کے کلام میں آنا چاہیئے ۔ ان کی نظموں کی ترقی پسندوں میں وہی پوزیشن ہے جو کسی عرس میں مسجد کے موذن کی ہوتی ہے ۔ کلام میں جنسی ہچکولے اور زبان میں عورتیا نہ مخموریت" پائی جاتی ہے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

ہاں سر شام اڑا
اپنی دوروزہ محبت کا مذاق
اس میں ہوگا مری توہین کا پہلو بھی ضرور
میری توہین — مرے پاس وفا کی توہین ۔
ہاں سنا ہے کہ وفا کس کو کبھی
کر کے اقرار محبت کیسے
پھیر لیں تو نے اچانک آنکھیں
یہ بھی اک طرز ادا ہو شاید
تیری فطرت کے لیے باعث ناز

مسعود قریشی

ان کے کلام میں ایک خیال ہوتا ہے جو ٹکڑے ٹکڑے اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں نظم ہوتا ہوا آگے بڑھتا ہے مگر زبان اور بیان سے مسعود کم اور قریشی زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ مصرعوں کے جوڑ جوڑ کا درد نکالنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر درد نکل نہیں پاتا۔ ان کا کلام ہومیو پیتھک کی دوا کی حیثیت رکھتا ہے جس کے پینے سے اگر کوئی فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہیں ہوتا۔ شعر اس لئے کہتے رہیں کہ شاعری کرنا عشاء کی تین رکعتوں کے بعد وتر کی طرح فرض سمجھتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

کلرک

زندگی ایک بوجھ
روح کچھ چور چور جسم نڈھال
ایک گھٹی گھٹی سی فضا

اور احساس چاکری کا دباؤ
ذہن پہ فائلوں کے بارِ گراں

جو جن سے ذہانتوں کے وجود
افسری کے حسین جال میں قید
چند زاندگلوں کے حلقہ بگوش
یعنی چاندی کی چند زنجیریں

جسم کی قید پہ بڑھائے ہوئے
اپنے آقا کی ذلتوں کا شعور
اپنے محکوم پہ اگلتے ہوئے
اُن پہ احساس برتری کا تناؤ

مظفرؔ

آزاد نظم میں واقعہ نگاری کرتے ہیں۔ بجریوں کے چلتے گلے میں اگر کوئی مرغی یا بطخ پھنس جاتی ہے تو وہ دو تک ریلے میں قاؤں قاؤں کرتی چلی جاتی ہے اسی طرح اگر کوئی دوبرابر کے قافیے ان کی نظم کے ریلے میں آجاتے ہیں تو وہ بھی بہت دور تک نظم ہوتے چلے جاتے ہیں مگر چونکہ یہ ردیف اور قافیے کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور بلا سبب اُن کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ بیانز روانی۔ اور تخئیل میں بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ نتائج کا ایک ٹکڑا پڑھیئے اور اگر داد کا مستحق سمجھیے تو داد دیجئے۔

سطح دریا پہ وہ لرزاں سا سنہرا بجرا
ملکۂ مصر ہے وہ اولین تقریب نشاط
اُس کی آنکھوں میں تھی راتوں کی سیاہی پنہاں
اُس کی بدمست اداؤں میں جنوں خیزی تھی
کتنا سرکش تھا شباب
وہ شبستان مراد
مشرقی عیش پرستی کا مرقع گویا۔ عود و عنبر کا دھواں

مدنی حامد عزیز

ان کے کلام میں کافی شعریت ہوتی ہے اور ان کی آزاد نظموں کے مصرعے معنویت سے بے بہرہ نظر نہیں آتے چھوٹے بڑے مصرعے ضرور ہوتے ہیں مگر اُن میں کافی ربط وضبط اور تفکر نظر آتا ہے۔ پوری نظم میں خواہ موسیقیت ہو یا نہ ہو مگر ہر مصرعہ میں علیحدہ علیحدہ ایک کیف ضرور ہوتا ہے۔ آزاد نظموں کو رنگین رنگین الفاظ پہنا کر اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ وہ کس حد تک ادب کو زیب دینے میں کامیاب ہو سکتی ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ نظم آزاد کا لنڈورا پن اس کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اشعار کم کہتے ہیں اس لئے اچھے ہوتے ہیں۔ آپ کی نظم "افکار" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

افکار

میّتیں کتنے ارادوں کی مجھے روز ملیں
جامِ خیّام و ارسطو کی کتابوں کی قسم
درسگاہوں کی فضاؤں میں اندھیرے وہ ملے
جس میں آزادیٔ احساس کی کلیاں نہ کھلیں

ابھی زنجیر بھی قیدی کی بھی پر و بال بھی ہیں
دستِ آدم میں ابھی موت کے جنجال بھی ہیں

محمد خلیل الرحمٰن

بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ نظم میں چھوٹے سائز کے مصرعے لڑکھڑاتے ایک دوسرے کا سہارا لیتے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہر نظم کو ایک خیال کے شانے سے سنوارتے ہیں۔ ثقیل الفاظ کے بجائے مصرعوں کو سیّال لفظوں اور دلکش بندشوں کا ساگودانہ پلاتے ہیں نظم ایک بحر پہ گذر بسر کی قائل ہے۔ مصرعوں کے چہرے بشرے سے بشاشی اور ذہانت ٹپکتی ہے۔ ان کا کلام خلیل شاہ کی فاختہ سے زیادہ قوت پرواز رکھتا ہے۔ الفاظ میں دل لبھانے والی معصومیت پائی جاتی ہے ان کے انتظار کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو ـــ

کتنی رات گئی ہے!

بلبلیں
پھر شبنم سے بھیگ چلی ہیں
کتنی رات گئی ہے!
گاہے گاہے خاموش ہیں۔
اک آواز کی نازک موجیں
تھر تھراتی ہر سو بڑھتی ہیں
سایوں کے جھرمٹ میں افق پہ
کہتے رہتے کھو جاتی ہیں
اوس سے بوجھل سرد فضا میں

تھک تھک کر سو جاتی ہیں
کتنی رات گئی ہے!

مسعود زاہدی

آپ کی آزاد نظمیں ٹھن کرتی چلتی ہیں اور باہمن کی بچھیا کی طرح آپ کی آزاد نظم
مختلف بحروں پر منھ مارتی اور مچگائی کرتی دکھائی پڑتی ہے۔ مصرعے ایک دوسرے پر
دانت پیستے نظر آتے ہیں کلام میں ایک عمدہ اخبار کی نامہ نگار والی شان پائی جاتی
ہے دس پندرہ برس بعد جب نظم آزاد میں اخبارات اور رسائل نکلیں گے اُس وقت
آزاد اخبار نویسوں کے لئے آپ کا کلام امرت دھارا سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ آپ
کافی زود گو ہیں اور نظمیں بہت زود ہضم قسم کی کہتے ہیں ہر مصرعہ رواں دواں جھومتا
جھامتا شاعروں میں اس طرح سلام لیتا چلتا ہے جس طرح کسی کبڑیئے کا دولھا شرک
والوں کو گھوڑی کی پیٹھ سے سلام کرتا ہوا گذر جاتا ہے۔ اشعار میں دل و دماغ کی جگہ
قلم دوات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔

ترانے فسانے

مگر جانی ہیں کب تحقیق کی نظریں
تہوں میں زندگی کی چھوڑ کر سطحین
اگر جائے تو کوئی جاکے یہ دیکھے
گراں ہیں کس قدر یہ پیت کے نغمے
محبت کس قدر انمول ہوتی ہے ؟
حقیقت یہ ہے دنیا میں
خواہ زیست ہو الفت ہو یا رسمی محبت ہو

محمد ذوالنورین

رات کو تہجد پڑھتے ہیں اور دن میں شاعری کرتے ہیں۔ نام سے اولیا اللہ اور کلام سے فی سبیل اللہ ہیں۔ تخیل دبے پاؤں ایک آدھ مصرعہ کہہ کر اس طرح دبک جاتی ہے جس طرح چوہیا چپاتی کتر کر اپنے بل میں دبک جاتی ہو۔ نظم آزاد کے پیچھے لمبے مصرعوں میں درود پڑھ پڑھ کر دم کرتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے کلام آزاد نظم کا سجادہ نشین معلوم ہوتا ہے۔ اگر شاعر نہ ہوتے تو کسی مسجد میں بہترین موذن ضرور ہوتے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

رات سے خطاب

رات میں تجھ پہ نثار

تیری خاموشی سے

میرے

دل کی آوازیں۔

بلند

محمد صفدر

یا تو خود اپنی شاعری سے تنگ ہیں یا ان کی شاعری ان سے تنگ ہے چنانچہ چھٹے چھماہے جب کوئی آزاد نظم پکڑ پاتے ہیں تو دو رکسی رسالہ میں اس طرح چھوڑ آتے ہیں جیسے کوئی لاگو بلی سے تنگ آکر اس کو دریا اُس پار چھوڑ آتا ہے۔ الفاظ ملائم اور پگھلائی ہوئی کٹھیا کے سے استعمال کرتے ہیں اگر پوری نظم پڑھئے تو دو تین مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں آپ کو کانگریسی ہم آہنگی، احراری خبیثی، اشتراکیت آمیز ندرت اور مسلم لیگی ترنم ملتا ہے۔ آپ کی نظم کنارِ دریا کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

شہر کے وحشت کی زنجیروں سے دور
خواب سے ناآشنا سنگین دیواروں سے دور
جبر سے پابستہ انسانوں سے دور
چاند کے چاندی سے پھول
پُرسکون پیڑوں کے نیچے خاک پر بکھرے ہوئے
اُن میں جھینگی صدائیں
جھینگروں کی نرم لہروں کی صدائیں

مجید امجد

ترقی پسندوں کے پیچھے پیچھے کسی خاص غور و فکر کے ماتحت ایک عرصہ سے ٹہل رہے ہیں۔ شاعری میں تخئیل کے مختلف زاویئے پیش کرتے ہیں کبھی کبھی اچھے شعر بھی کہہ گذرتے ہیں مگر شعر کہتے وقت دل سے زیادہ دماغ پر زور دیتے ہیں .... کلام پڑھنے والا ہوتا ہے مگر دماغ میں محفوظ کر لینے والا نہیں ہوتا۔ اکثر نظموں میں مصرعے ایک دوسرے کے پیچھے ایک موضوع لے کر بحث کرتے چلتے ہیں جس طرح سینما کے تماشائی آگے پیچھے بلا ضرورت کسی مسئلہ پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

آج آخر دل میں میں نے ٹھان لی
آج ان کے پاس جاؤں گا ضرور
پار اُن جھیلی چراگاہوں کے پار
ہانپتی پگڈنڈیوں سے دور دور
اس طرف اک عمر سے آیا کئے
میرے نام انکے بلاوے روز و شب
دل کو سندیسے، نگہ کو دعوتیں
شوق میں ڈوبے ہوئے پیغام سب

منظر سلیم

ترقی پسندوں کی بچہ شاعری کے ناٹک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کی قسم کے غیر
سند یافتہ مستند شاعر جناب منظر سلیم نہایت کامیاب قسم کی مڈل پاس شاعری کرتے ہیں
کلام میں گلہری کی کمر کا لوچ اور خرگوش کی سی پھدک پائی جاتی ہے۔ شاعروں کی داد
داد سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے "ترقی پسندوں" کے گھڑے پر
آنکھ پر پٹی باندھ کر ایسا لٹھ مارتے ہیں کہ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے چائے ادیبوں کی
طرح پیتے ہیں اور اشعار "ادب لطیف" قسم کے کہتے ہیں ترقی پسندوں کی آزاد نظمیں پڑھ
پڑھکر آزاد نظم کہنے لگے ہیں کلام کہیں بھی مذاق سلیم سے نہیں گرنے پاتا۔

میرا ماضی

ایک ویران مقبرے کے قریب
بہکی بہکی ہوئی سی آوازیں
کھوئے کھوئے ہوئے سے سناٹے
صبح کے سرمئی دھندلکوں کو
دے رہی ہیں ہوائیں ہچکولے
سہمی سہمی ہوئی سی تاریکی
ٹوٹے پھوٹے ضیا کے فوارے
رات کے نرم نرم بستر پر
کروٹیں لے رہے ہیں کچھ تارے

مخدوم محیؔ الدین

بظاہر مخدوم ہیں مگر بہ باطن خادم۔ علی سردار جعفری کی طرح یہ بھی اپنی حیات و ممات کے جملہ حقوق کمیونسٹوں کے نام محفوظ کرائے ہوئے ہیں۔ فرشتوں کی فروگذاشت سے ہندوستان میں پیدا ہوگئے ورنہ پیدا ارس ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ ایم۔ اے پاس کر کے لکچرر ہوگئے تھے مگر دماغ میں کمیونزم اور سوشلزم کی کوک اس قدر بھری ہوئی تھی کہ ملازمت چھوڑ چھاڑ مزدوروں کے مصلح ہو گئے۔ ہندوستانی مزدوروں کی تنظیم اور اصلاح کے لئے جو لیڈر بھی گھر سے نکلتا ہے اس کی قسمت میں جیل کی چہار دیواری، چمڑ پٹے کا ساگ اور بٹرے کی روٹی ہوتی ہے چنانچہ جب انھوں نے لیڈری شروع کی تو ان کو بھی عنوانات بدل بدل کر سزائیں دی گئیں۔ کلام میں "استالینیت" پائی جاتی ہے۔ اشعار بر اعظم روس سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ اگر مزدوروں کی اسٹرائک کرانا بند کر کے محض شاعری ہی پر قناعت کرتے تو غالبًا بہت سے "ترقی پسند" شاعری چھوڑ چھوڑ کر نئے زمانہ کی ہاکری پر اتر آتے، مگر ان شعراء کی خوش قسمتی اور ان حضرت کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ یہ بیچارے ادھر پھنس کر رہ گئے اور صرف "سرخ سویرا" پیش کر سکے ورنہ اگر ان کو دوسرے کاموں سے فرصت ملتی تو خونی دوپہر، روسی سہ پہر، گلابی جھٹ پٹا اور توتلی رات قسم کے نہ جانے کتنے مجموعوں سے دنیائے ادب کو نواز چکے ہوتے۔ اچھا ہوا کہ ان کی ذہانتوں کا طوفان میں صرف مزدور اسپیشل بن کر رہ گیا۔ ورنہ بہت سے کمیونسٹ شعراء کی دوکانیں بند ہو جاتیں۔ شعر نہایت نفیس قسم کے کہتے ہیں نظم آزاد اور نظم معریٰ بہت ہی کم کہتے ہیں۔ ان کی آزاد نظم استالین

جو ایک روسی نظم کا ترجمہ ہے اپنی تکنیک کے لحاظ سے بہت خوب ہے چنانچہ اس کی ایک کاپی آپ کو ہر ترقی پسند کے پاس ضرور ملے گی کیونکہ وہ اس کو بندر کا بچہ بنائے ہوئے گھومتے ہیں۔ کلام میں سیاست، محبت اور فلسفہ ہوتا ہے مصرعے خوشنما الفاظ میں ملبوس، حیرت اور لطیف بندشوں کے جادہ پر خراماں خراماں مسکرا مسکرا کر ٹہلتے نظر آتے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا — کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمین گاہ
وہ تہذیب کے جسم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر۔

راشد فضلی

نام جناب فضلی آئی۔سی۔ ایس۔ سے بالکل متصل معلوم ہوتا ہے۔ حضرت فضلی کی
شاعری میں جیسے پابند بجکا نے مصرعے ہوتے ہیں اسی طرح راشد فضلی کے یہاں حضرت
سہا شاہجہانپوری سائز کے مصرے ہوتے ہیں حضرت فضلی کا آئی۔سی۔ ایس ہو کر ادیب
اور خوش گو شاعر ہونا جتنا حیرت انگیز ہے اسی قدر راشد فضلی کا آزاد شاعری کے ساتھ ٹھٹھول
دلچسپ۔ آپ پابند شعر بھی کہتے ہیں مگر کلام میں جنسی پیاس کو زیادہ دخل ہے۔ ہر مصرعہ گا یا پہلوان
رعب جما کر جنسی آسودگی حاصل کرنے پر کمر بستہ نظر آتا ہے۔ ان کی آزاد شاعری کو اگر یوں ہی
چھوڑ دیا گیا تو بہت سے یونیورسٹی کے نوجوان گریجویٹ اس مرض کا شکار ہو کر اپنی زندگی تباہ کر لیں گے
کیونکہ بعض نظمیں نہایت گنجینی قسم کی کہتے ہیں آپ کا حسن طلب ملاحظہ ہو

طلب

یہ کیوں جاننا چاہتی ہو
یہ کیوں پوچھتی ہو
نہی کیوں ہو دشمن مری اور اپنی
ہو سنا کیا آف تمہارے بدن کی
مجھے چاہتی ہیں مجھے انگلیاں

کمال احمد صدیقی

لکھنؤ سے ملیح آباد تک کمالوں کی ایک ایسی خاص بستی ہے جس میں عارفانہ اور عاشقانہ شاعری سے لیکر فاتقانہ اور آزاد ترقی پسندانہ شاعری کرنے والے ایک سے ایک طرحدار اور بے طرح باکمال پڑے ہیں ان میں کمال صدیقی آخرالذکر قسم کی شاعری کے نوجوان سجادہ نشین ہیں اور پابند نظموں سے زیادہ آزاد نظمیں آپ کے دست تخیل پر سبک ہوتی ہیں آپ کی طویل آزاد نظموں کا جسم زمانہ غدر کے فرنگی مقتولین کی قبروں سے مدرجہ مناتر نظر آتا ہے یعنی اوپر سے تپلا اور نیچے سے خاصہ چوڑا - عام ترقی پسندوں کی طرح آپکے یہاں بھی کہیں تاریکی "لیٹی" نظر آتی ہے اور کہیں تابندگی "اٹھا بیٹھی" کرتی دکھائی پڑتی ہے - ترقی پسند رسائل میں آپ کی بیشتر آزاد نظمیں ابہام کا گھونگھٹ کاڑھے اور بصد وقت منہ چھپائے نکلتی ہیں چنانچہ آپکی آزاد نظموں کے مصرعے میراجی کی آزاد نظموں کے غیر تربیت یافتہ رنگروٹ سے معلوم پڑتے ہیں - جن آزاد نظموں میں ابہام دال میں نمک کے طور پر استعمال ہوتا ہے انکو پڑھکر ہم بجائے ان کے ان کے والد کی خدمت میں حاضر ہوکر مبارکباد دیتے ہیں کہ مبارک ہو لڑکا چل نکلا نمونہ کلام ملاحظہ ہو -

تنہائی

کوئی خواہش کوئی امید نہیں
اُف گرانبار جمود
چھا گیا وسعتِ احساس کی پابندی پر
قبر میں لیٹی ہوئی تیرگی کی طرح شبستان وجود
بے نیازِ شب تاریک ہے بیگانہ تنویر سحر

محمد ضیاء الاسلام

کوئی جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتا ہے آپ محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب دیکھتے ہیں، شاعر بھی ہیں، نقاد بھی اور ڈپٹی کلکٹر بھی اپنا کلام اور مضامین چھپوانے کے معاملہ میں بے حد فضول خرچ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ کلام سے کہیں زیادہ میں ان کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سرکاری دنیا کے علاوہ ادبی دنیا میں بھی آپ اپنے کو بی۔ ایس۔ سی اور پی۔ سی۔ ایس کی حیثیت سے روشناس کراتے ہیں۔ اقبال جوش اور جگر کے گرویدہ ہیں۔ ریڈیو والے ڈپٹی کلکٹر قسم کے ادیب اور نقاد سمجھ کر آپ سے کتابوں پر ریویو لکھواتے ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں اور کلام صرف ان ہی مشاعروں میں پڑھتے ہیں جن کے خود منتظم ہوتے ہیں۔ دوسروں کے شعر گنگناتے گنگناتے اس طرح اپنے شعر موزوں کر لیتے ہیں جس طرح بگلا اپنے سر کو جنبش دیتے دیتے مچھلی پکڑ لیتا ہے۔ چہرے سے ذہانت کے فوارے چھوٹتے ہیں گفتگو میں بہت زیادہ جاذبیت ہوتی ہے انگریزی اور اردو شعراء کا کلام اس طرح اپنا لیتے ہیں کہ ان کی نظموں میں ان کے بہت سے مصرعے اینگلو انڈین معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ہی نظم میں کئی کئی بحریں استعمال کرتے ہیں انگریزی نظموں کے تراجم "نثر موزوں" میں کرتے اور انھیں آزاد نظم سمجھ کر ترقی پسندوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہیں شاید انھیں یہ نہیں معلوم کہ آزاد نظم میں بھی صرف ایک بحر کے مختلف ارکان کی پابندی لازمی ہے۔

جس پہ سو بار خدائی ہو نثار
وہ جانِ آرزو نکلی وہ گلستاں کی اک کلی نکلی
خاموش و سوگوار
محبت کے غم اٹھائے ہوئے -
دل اس کا محبت کا اسیر
ہائے وہ اس کا شرابی سا بدن
ایک سرمایہ دار کی جاگیر
اس کے خاموش لب مرے نالے
یہ سب آرزوئیں یہ آنسو دعائیں
جنبش نہ دے سکیں گے خدائے بلند کو

غیث الرحمٰن

جبتک ہندوستان میں تھے تو اُردو میں فرانسیسی بولتے تھے آجکل انگلستان میں عجب نہیں جو اُردو زبان میں انگریزی بولتے ہوں علی گڈھ سے ڈبل ایم۔ اے ہیں اور کلام میراجی ڈیپوڈی کا ماڈل پاس معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے کلام کی ہمارے ادب میں وہی حیثیت ہے جو میلارمے کے کلام کی انگریزی ادب میں! اردو ادب کے جارلس مورون جناب میراجی ہی ان کے کلام کی تفسیر لکھ سکتے ہیں کیونکہ آپ سہ نثر ظہوری قسم کے شعر لکھتے ہیں۔ زود گوئی سے نظموں کا ناطقہ بند کئے رہتے ہیں۔ ترقی پسند شعراء سے زیادہ چند مخصوص رسائل آپ کے کلام کی زد میں آئے ہوئے ہیں اشعار تنقید و تبصرہ سے بالا ہیں اچھا ہوا کہ کوئی مجموعہ نہیں شایع کیا ورنہ مفسر[1] کی تلاش کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی۔ اشعار دیکھنے میں موزوں ہوتے ہیں اور عید بقر عید اُن میں معنویت کے کھنڈرات بھی ملتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

بہار

بہار آئی

سکوت پرور دش زندگی آنسوؤں کی چلمن سے مسکرائی!

تم ایک انداز بے نیازی سے سر اُٹھا کر جھٹک دو شب رنگ گیسوؤں کو

ہنسی سے بے تاب ہو کے تم ناگہاں کسی پیڑ کی گھنیری مہکتی چھاؤں میں لیٹ جاؤ

اور آفتاب سحر کی نوخیز نرم کرنوں کو فرطِ عشرت سے اپنی آغوش میں جکڑ لو

نہ جانے کن کن حسین خوابوں سے اپنی بے برگ و بار راتوں کو میں نے آراستہ کیا تھا ۔۔۔

---

[1] اسٹیفانے میلارمے فرانس کا مشہور ابہام پرست شاعر گزرا ہے۔ اس کے کلام کا ترجمہ آرٹ کے مشہور نقاد راجر فرائی نے کیا تھا۔ انگریزی میں اس کی نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اکثر نظموں کے ساتھ چارلس مورون کو ان کی شرح کرنا پڑی۔

مظہر لکھنوی

علی مظہر نام مظہر تخلص کرتے ہیں۔ آپ کی آزاد نظمیں دوست و احباب کے گھر غالباً دو ہی میں بیٹھ کر آتی جاتی ہیں کیونکہ رسائل میں کہیں نظر نہیں پڑتیں جب طالبعلم تھے تو ترکش لے کر ادبی اندھیرے میں تیر چلاتے تھے اب کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن ہیں۔ کمیونسٹ مشاعروں میں بحیثیت شاعر کے اور نامحرم مشاعروں میں بحیثیت سامع کے شریک ہوتے ہیں۔ کلام میں عجیب الطرفین قسم کی شگفتگی ہوتی ہے۔ آزاد نظمیں بھی کہتے ہیں مگر وہ بہت شرمیلی ہوتی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جام آخری

آج اے دوست مری سمت بھی اک جام بڑھا
محفل شوق سے اٹھ جاؤں گا میں آج کی رات
زندگی آج مجھے لینے کو آ پہونچی ہے۔
میں نے چاہا تھا محبت کی حسیں وادی میں
ان چمکتے ہوئے تاروں کا سہارا لے کر
منتظر صبح درخشاں کا رہوں
اپنی خود ساختہ امیدوں کو
خود فریبی کے دکھاتا رہوں رنگیں جلوے (وغیرہ وغیرہ)

ا ؎ لکھنؤ کا ایک مرحوم رسالہ جو چند ماہ زندہ رہکر فوت ہو گیا۔

محمد ظہور نظر

بیشتر نظموں میں مال گاڑی کے ڈبوں سے بھی زیادہ مصرعے ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے مصرعے یتیم خانے کے مختلف العمر بچوں کی طرح قواعد کرتے دور تک چلے جاتے ہیں۔ جب تک ان کی نظم کا بڑا حصہ نہ پڑھئے اس وقت تک آپ یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے کہ یہ کہتے کیا ہیں جس طرح چکوترے میں چھلکا دبیز اور رس برائے نام ہوتا ہے یہی حالت ان کی نظموں کی ہے۔ مصرعے بحر سے نہیں گرنے دیتے۔ کلام پڑھنے میں اچھا مگر لکھنے میں خراب ہوتا ہے۔ بعض مصرعے وشوامتر عادل کے مصرعوں کے ہم زلف معلوم پڑتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

شراب خانہ کی سیڑھیوں پر قدم مرے لڑکھڑا گئے تھے
ابھی مری قوت ارادی
فریب کے جال میں ہے شاید
جواں ہجولیوں کی ٹولی
مجھے بھی ساتھ اپنے لے گئی تھی
غلیظ گلیاں عبور کر کے حسین دو منزلے مکان میں
عجیب بے باک زندگی تھی
میں چپ تھا جیسے کوئی بھکاری خدا کے دربار میں کھڑا ہو۔
مری جموشی سے تنگ آ کر۔

نصیر حیدر

بہت کم لکھتے ہیں مگر جو لکھتے ہیں اس پہ اس طرح بار بار نظر ثانی کرتے ہیں جس طرح کوئی سفید ریش بزرگ خضاب لگا کر آئینہ میں سفید بال تلاش کرتا ہے کلام میں "ٹھنڈی سی حرارت" "گرم خنکی" اور "خشک تری" پائی جاتی ہے خیالات میں محبت کا کساؤ اور غم کی سنجیدگی نے کلام کے ذائقہ کو باسی پلاؤ کے مزہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی نظموں کے تمام مصرعے ہم مذہب اور ہم عقیدہ ہوتے ہیں مگر بعض بعض جگہ دو مصرعوں کو ملا کر ایک طویل القامت مصرعہ بھی آسانی بنایا جا سکتا ہے

نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

ٹھنڈا الاؤ

جس دمکتی ہوئی رنگینی غم کا پرتو
تیرے بلور پہ پڑتا تو دمک اٹھتا تھا
آج اس آگ کے شعلے میں کہیں وہ رنگ نہیں
حیف وہ آتش جذبات ——— وہ غم
اور وہ تصویر بتانی تیری
سب کے سب جل بھی چکے
اور اک تودۂ خاک
کوئی کہتا ہے ابھی پاؤں کو پھیلائے ہوئے۔

نشاط شاہدی

آپ کی نظموں میں سنبھلی سنبھلی سی کیفیت پائی جاتی ہے بہت کم نظمیں لکھتے ہیں کلام میں بعض جگہ فیض اور بعض جگہ ن۔م۔ راشد کے کلام کی جھلک نظر آتی ہے الفاظ کی شیرینی ہے بہت مصرعے لب بند نظر آتے ہیں۔ آپ کی بعض نظمیں آزاد نظم کا ایک ایسا نمونہ ہیں جن پہ انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی کلام میں ابہام کی لطیف ترشی معنویت کے تلذذ میں اضافہ کرتی چلتی ہے ترقی پسندوں" کی ڈھالی ہوئی ترکیبیں اگرچہ بعض بعض جگہ استعمال کرتے ہیں مگر اس کے باوجود کلام کو ترقی پسندی کا بند نغمہ نہیں معلوم ہوتا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ویران مسجد

آمرے ملحد ہمراز تجھے لے جاؤں
ایک ویران سی مسجد میں جہاں کوئی نہیں
اپنے اجداد کی روحوں نے یہاں لوٹے ہیں
ہچکیاں، نالے، پریشان دعا، اشک حزیں
فرش پر سمٹے ہوئے زہد کے سجدوں کے نقوش
خاک سے منبر و محراب کے شانے بوجھل
کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کی فضا میں لرزش
غیر مرئی سی تصاویر نظر سے اوجھل

نکہت نسیم

نام میں نسیم کے ساتھ نکہت کو کیا شامل کیا ہے گویا پلاؤ کی ہانڈی میں کیوڑے کی بوتل انڈیل دی ہے۔ پابند اور آزاد دونوں قسم کی نظمیں لکھتی ہیں۔ کلام میں روانی شگفتگی اور شادابی پائی جاتی ہے۔ اشعار میں بعض جگہ معنویت محض مصرعوں کے پینڈوں کو چھو کر اس طرح نکل گئی ہے جس طرح برسات کی امس میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جس سے انسان پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہونے پاتا۔ شعر تندرست اور صحت بخش ہوتے ہیں جن میں جگہ جگہ محبت مسکرا مسکرا کر کچھ خاموش مطالبے کرتی نظر آتی ہے۔ بتائیے وہ مطالبات کیا ہیں؟ —— آزادیٔ وطن یا —— ؟

کشمکش

میں محبت کے تقاضے بھی سمجھتی ہوں مگر
میں حقیقت کے اشارے بھی تو پہچانتی ہوں
میں تری یاد میں خود اپنے لیے غافل ہوں
ماسوا اپنے کسی اور کو بھی جانتی ہوں۔

نشور واحدی

دبلے پتلے خشخشی داڑھی رکھے ہوئے ترقی پسند شاعر جناب نشور واحدی صاحب اگرچہ ترقی پسند رسائل میں واحد حاضر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک کلام کا تعلق ہے واحد غائب نظر آتے ہیں۔ بہت کچکچا کر شاعری کرتے ہیں ان کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر آپ ان کو نیچے سے پڑھیں تو بھی وہی لطف آئے گا جو اوپر سے پڑھنے میں آتا ہے۔

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا

بہت سی نظمیں پہیلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ پڑھنے والے کا ذہن ہر ہر مصرعے سے نظم کی منزل مقصود دریافت کرتا چلتا ہے مگر ہر مصرعہ جب اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے تو ذہن اس مرتبہ گھس گھس سے نجات حاصل کرنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ بعض بعض جگہ آپ ایسے نامانوس الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کرتے ہیں کہ جناب سلام مچھلی شہری کے کلام کی معنویت بھی آداب بجا لانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ان کو ادب میں جدید اضافہ سمجھ کر چھوڑ دینا ہی زیادہ مناسب ہے۔ الفاظ میں ایک کامیاب تقل پایا جاتا ہے۔ اگر شعر نہ کہتے تو غالباً اسی تعداد میں بچے پیدا کیا کرتے اچھا ہوا کہ شاعری شروع کر دی ورنہ ہندوستان کے چالیس کروڑ غلمٹوں میں دس پانچ نفر آپ کے بھی مرہون منت ہوتے۔ آپ کی آزاد نظموں میں ایک قسم کا "میٹھا میٹھا" جھکاؤ "ہلکا ہلکا" ڈکاؤ اور پھیکا پھیکا "بہاؤ" پایا جاتا ہے مندرجہ ذیل نظم کسی عدالتی مقدمہ کی کارروائی معلوم ہوتی ہے بدنصیبی سے اسکول ماسٹر ہو گئے درنحالیکہ ان کو کورٹ میں ریڈر ہونا چاہیئے تھا مصرعوں میں اوزان کے قائل ہیں اور ان کی تندرستی

برقرار رکھنے کے لئے ہائی جمپ اور لانگ جمپ دونوں کراتے رہتے ہیں ۔

نمونۂ کلام

دیکھ یہ آئینہ چیں جبیں
رنگ چہرے کا ہے فق

ایک مجرم پابہ زنجیر اور عدالت کا مکاں
کچھ عزیز اور اقربا
غمزدہ اور ناتواں
سیکڑوں جونکیں ہیں ان کے جسم سے لپٹی ہوئی
عدل کے تالاب کی یہ مچھلیاں
ہیں نہنگوں کے دہاں
ہے شکم میں ان کے دست دگردن عدل غریق
فکر طوفاں ہے رفیق
دیکھ یہ آئینہ چیں جبیں
اور اس پہ یہ دراشت کا غبار

ن ۔ م ۔ راشد

صف اول کے ترقی پسند شاعر جناب نذر محمد صاحب راشد کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز ہم آپ سبوں سے نرالے اور انوکھے ہیں۔ ان کے کلام میں ابہام کے دام جگہ جگہ بچھے ملتے ہیں۔ بیشتر نظموں میں آپ کی شاعری مفروضہ ازدواجی زندگی کا ریہرسل کرتی ملتی ہے اپنی شاعری میں کہیں یہ آپ اپنی محبوبہ سے منکوحہ بیوی کا سا برتاؤ کرتے ملتے ہیں اور کہیں یہ اسے داشتہ آمدبہ کار سمجھ کر اپنے جنسی تقاضوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپ کی ایک ہی نظم میں سیاسی اور سماجی کشمکش دیکھ کر دماغ اس قدر مختل ہو جاتا ہے کہ ان کی محبوبہ کے خدوخال تک پڑھنے والے کے دماغ سے معدوم ہو جاتے ہیں اور محض اس کا برہنہ جسم پڑھنے والے کو اس کی محنت کے معاوضہ میں ملتا ہے کسی نظم میں اگر آپ جنسی جذبے قبل کی حالت نظم کرتے ہیں تو کسی میں اس کے بعد کی کیفیات کا تجزیہ نہایت لطیف انداز میں کرتے ملتے ہیں۔ کہیں محبت کا اقرار ہے تو کہیں انکار۔ کبھی دماغ ایک ذہنی گناہ کا مرتکب ہونے کے بعد راہ فرار اختیار کرتا ملتا ہے اور کبھی بہادر سپاہیوں کی طرح دشمنوں کے سامنے سینہ تانے مدمقابل نظر آتا ہے کبھی آپ کی تخیل فرنگی عورتوں پر دست تصرف دراز کرتی اور انتقام لیتی ملتی ہے۔ تو کبھی انہی کے آغوش کو اپنی پناہ گاہ بنائے نظر آتی ہے۔ کبھی اپنی مفروضہ محبوبہ میں "ضروری ضروری چیزیں" تخلیق کرکے آپ اس کی خانہ پری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اور کہیں یہ اس طرح اس کے سامنے مودب کھڑے ملتے ہیں جیسے ایک سعادت مند لڑکا اپنی والدہ کے سامنے کھڑا ہو۔ کبھی زندگی کی کشاکش سے اکتا کر قہوہ خانوں، رقص گاہوں اور

باغوں کے گوشوں میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں اور کبھی ساتویں منزل پر چڑھ کر بھاندے پیٹتے ہیں۔ کبھی عورت کو میدان جنگ میں لئے جاتے ہیں اور کبھی مذکورہ کی طرح اس کی ڈیوڑھی پہ دستک دیتے دکھائی پڑتے ہیں۔ کبھی غم سے بھاگ کر جنس میں پناہ لیتے ہیں اور کبھی جنس سے بھاگ کر غمکدہ کی رونق بنتے ہیں۔ غرض ایک عجیب بھگدڑ ہے جس سے پڑھنے والا ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر فساد نہیں ہوا ہے تو عنقریب ہونے والا ہے۔ کبھی لذائذ کو چرا کر اس پہ خجل ہوتے ہیں اور کبھی اسی مال مسروقہ پر فخر کرتے ہیں۔ جنسی آسودگی کے معاملے میں جب خدا کو حائل پاتے ہیں تو قوت خداوندی کو تشدد پر محمول کر کے مرن برت پہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات جنسی تمردی کے تاریک غاروں کے گرد ٹہلتے بھی دکھائی پڑتے ہیں۔ غرض انکی شاعری میں مایوسی، کم ہمتی، خلوت نشینی اور جنسی تسکین کے غیر فطری جذبے کو زیادہ دخل ہے۔ اپنی نظموں میں ایسے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جن کے مفہوم کو ان کے جذبات کی شدت سے دور کا لگاؤ نہیں ہوتا۔ نہ ان کے یہاں فرائڈ کی خودی ہے اور نہ اقبال کا فلسفہ۔ بلکہ اس کے بین بین کوئی ایسا نظریہ ہے جس کو عقل کی کسوٹی پر کسا تو جا سکتا ہے مگر اس کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

آدمی پڑھے لکھے سوڈیشی ہیں مگر سوچنے اور سمجھنے کے انداز بدیسی ہیں۔ مغربی ادب سے حد متاثر ہیں۔ موجودہ ادب میں ان کی شاعری نے ایک ایسی راہ ضرور پیدا کر دی ہے جس پہ ابھی چلنے والے بہت ہی کم لوگ ہیں اور جو لوگ ڈرتے ڈرتے چل دئے ہیں ان کو اپنی منزل کا پتہ نہیں۔ ان کی تقلید معمولی استعداد والے آدمی کے بس کا روگ نہیں چنانچہ جو لوگ ان کی تقلید کرنے پر تلے ہیں وہ ادبی دنیا میں ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :—

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری ؟
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے ، رہگذاروں سے لپٹتے ، سوگوار ،
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا ۔

نیاز حیدر

آزادیٔ وطن کے دیوانے کمیونسٹ شاعر نیاز حیدر آزاد نظمیں نہایت "کس" کے لکھتے ہیں۔ پاپ کے دو تین کش کھینچ کر جب یہ آزاد نظم لکھنے بیٹھتے ہیں تو دس پانچ اچھی اور بستہ قد آزاد نظمیں لکھنے والے اُن کی فرلانگ دو فرلانگ لمبی نظموں کا منہ دیکھ کر رہ جاتے ہیں میراجی کی نظموں کی طویل بحر میں اگر کسی کے سامنے گھنٹوں گھٹ کاڑھ کر بیٹھ سکتی ہیں۔ تو وہ نیاز حیدر صاحب ہی کی نظمیں ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کی ہر نظم آفریدی پٹھان کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ کلام میں لطیف مگر "سریٹ" طنز ہوتا ہے پچھلا مصرعہ اپنے اگلے مصرعہ کو ڈانٹتا ہوا چلتا ہے اور پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی روسی کسی ہندوستانی کی گردن میں ہاتھ دیکر اس کو انگریز کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ یہ نہ ابہام کے قائل ہیں اور نہ اشاریت کے ایک سچے اور سچ مچ کے آزاد شاعر ہیں اور بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر آزاد شاعری میں تقریر کرنے کا بھی دم رکھتے ہیں۔ کلام آمد کے سامنے تو ضرور آتا ہے مگر آورد سے کوسوں کھاگتا ہے۔ ملاحظہ ہو نمونہ کلام۔

اور انگریز حکومت کی ماں

(یعنی یہ صنعت و حرفت یہ تجارت یہ لوٹ)

گود لے لیتی ہے بن جاتے ہیں لے پالک ہم

سر کوئی رائے بہادر تو کوئی او۔ بی۔ اے

خاص فرزند کوئی یار وفادار کوئی۔

دیش بھگتی بھی، خطابات، وزارت بھی ملے
رہو غدار وطن بن کے تو جنت بھی ملے
اب چلو بھو کے غلاموں کو یہ تاکید کرو
کہ لڑیں لڑ کے فنا ہو جائیں
آسمانوں پہ ہے ان کی جنت
نہ مریں گے تو نہیں پائیں گے۔

نسیم محمود مخمور

آپ کا کلام جدید شاعری کا ایک پیاسا ہرا ہوا مقدمہ ہے جس میں کسی اپیل کی گنجائش نہیں۔
آپ اس کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے کیسے گانے اور چغتائی آرٹ کی درمیانی کڑی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جو
لڑکی جس طرح ایک بھیانک خواب دیکھ کر آؤ باؤ بکنے لگتی ہے اسی طرح آپ ہوش میں بے ہوشی
کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ آپ کی نظم کا ہر مصرعہ اس طرح ہوا میں معلق نظر آتا ہے جس طرح مرحوم چمگادڑ
بجلی کے تار میں — ترقی پسند رسائل نے آپ کا اکاؤنٹس تو کھول دیا ہے مگر ادبی دنیا سے اکثر
چیک ڈس آنر ہو کر واپس ہوتے ہیں — ہر مصرعہ ایک زندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پورا کلام محمود
جالندھری کے مصرعوں کی چوں چوں کا مربہ معلوم ہوتا ہے نہ الفاظ میں روانی ہوتی ہے اور نہ تخیل
میں تر و تازگی۔ ہر نظم بھدیاں آموں کا ذائقہ رکھتی ہے۔ الفاظ بے معنی اور بے کیف ہوتے
ہیں بعض بعض نظموں میں آپ نے قدیم شاعری کے برتن ڈیپ کو کر دے نئے تیل کا دیا دکھا کر شرمانے
کی کوشش کی ہے — نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

دو دن کا پیار

یہ دل وحشی مرا
طائر آوارہ تھا اس کو قفس کی کیا خبر
سادگی تھی تیری معصومی کا شاید تھا گناہ
آہ یہ دونوں کا پیار
مجھ سے اب مت پوچھ تو جب میں نے کیا سمجھا تجھے
اب مگر دو دن کے بعد
توڑ ڈالا ہائے کس بدبخت نے سارا فسوں —

وشوامتر عادل

آپ کی شاعری آغا تقی کے باغ سے نکل کر براہ راست میراجی سے متاثر ہوگئی ہے مصرعے لگاتے وقت بسا اوقات آپ کی تخئیل دیولا جین کی لمبائی سے متاثر ہو جایا کرتی ہے بعض مصرعوں کا عرض چالیس گز ہے تو ان کے عرض سے کچھ نکلا ہوا ہوتا ہے ۔ اپنی تمام شاعری کو آپ رٹ بنا کر پیش کرتے ہیں ۔ کلام میں لاشعوریت کا بہاؤ اور جنسیات کا کساؤ پایا جاتا ہے ۔ مجموعی حیثیت سے آپ ان کے کلام کو میراجی کا بایاں بازو کہہ سکتے ہیں ۔ جنسیات کی کائی میں ان کی تخئیل کے پیر پھسلے پڑتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ اسکیٹنگ کرتے ہوئے قدآدم ڈگ لیتے چلے جاتے ہیں ۔ آدمی پڑھے لکھے ہیں ان کے کلام کی حیثیت مشرقی ادب میں وہی ہے جو میرا بہن کی کانگریس میں ۔ نظموں میں الفاظ اور ترکیبیں ایسی لاتے ہیں کہ ان کا ایک علیحدہ فلم بن سکتا ہے اکثر ریڈیو اسٹیشن سے ان کی شاعری ڈل کی چال میں ریس کرتی ملتی ہے ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں میں آپ کی ایک نظم کا ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

برہنہ جسم ہے اور فضا بستر
خزاں میں فرش گلستاں کا ایک آئینہ
ذرا نظر تو اٹھاؤ نگاہیں ملتی ہیں
بکھیر دو کبھی حسین بال " لو بکھرتے ہیں
لپٹنے دو کبھی مجھے " میں لپٹا جاتا ہوں
کوئی بھی روک نہیں ہے کوئی بھی روک نہیں
فسردہ رات کی تنہائی اب سمٹتی ہے
یہ مجھ سے کہتی ہے ۔ کل یہاں نہ آئیگا

یوسف ظفر

آپ مبلغ نو سال سے آزاد نظمیں لکھتے ہیں بڑے حسّاس قسم کے انسان ہیں گھر میں اگر کوئی مرغی تک مرحوم ہوجاتی ہے تو اُس کے چالیسویں تک تین چار آزاد نظمیں ان فردِ مکانی کی یاد میں لکھ مارتے ہیں۔ اگر نظم آزاد اور نظم معری نہ لکھتے تو بیکاری سے گھبرا کر نہ جانے کیا کر بیٹھتے بہت زود گو ہیں اس لئے عجب نہیں جو آزاد نظم میں بات چیت بھی کرتے ہوں، عام آزاد نظم لکھنے والوں کی طرح آپ بھی ابہام کا شکار ہیں۔ خیالات میں سادگی، الفاظ میں خستگی اور مصرعوں کے اعضائے رئیسہ ہیں۔ خون کا دباؤ پایا جاتا ہے اشعار میں "درد آمیز سرور" پایا جاتا ہے اور جگہ جگہ "لطیف اور" بے کیفی کلام کو ٹھوکے دیتی چلتی ہے اشعار میں قنوطیت سے زیادہ یاسیت اور یاسیت سے زیادہ محرومی پائی جاتی ہے۔ آپ نوٹوں کی جلی ہوئی گڈی تک کی قطعہ تاریخ نکال لیتے ہیں اس لئے آپ آزاد نظموں میں نہایت حسین اور "جوان" مرثیے بھی کہہ سکتے ہیں۔ الفاظ خوبصورت ہوتے ہیں اور کلام قیمتی کاغذ پر ضخیم مجموعوں کی شکل میں شائع ہوتا ہے۔ ان کی بعض آزاد نظموں کے گرد ابہام کا ایک ایسا حصار کھنچا ہوتا ہے کہ وہاں تک عقل کا پرندہ پر نہیں مار سکتا جو اشعار بہت اچھے ہوتے ہیں ان کو یا تو مجموعے سے نکال دیتے ہیں یا کسی ایسے گوشے میں ڈال دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کی نظر نہ لگ جائے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

تین دیواروں نے محصور کیا ہے مجھ کو

تین دیواریں مجھے قید کئے بیٹھی ہیں

میری ہی عمر کی گھڑیوں سے جو تعمیر ہوئیں

میرے ہی اشکوں سے ہوتی ہے چراغاں جن میں

جن کی مٹی میں ہے گوندھی ہوئی میری تقدیر

میرے ہر سانس پہ جو گونج اٹھا کرتی ہے

جن کی اینٹوں میں مرے خون کی آمیزش ہے

(الف)

مرزا محمد جواد صاحب مالک نظامی پریس لکھنؤ
نے شائع کیا